جلد ۴۰	ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء	عدد ۳

مضامین

شذرات

۲۸-۲۹ اگست ۱۹۳۷ء کو پٹنہ مین انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کے کئی خاص اور عام جلسے ہوئے، خاص جلسون مین مقامی لوگون کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی اردو، مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اور دارالمصنفین کے نمایندے شریک ہوئے، اور ہندوستانی زبان اور بہار مین سرکاری تعلیم گاہون مین ہندوستانی کے ذریعہ تعلیم پر بحثین ہوئین اور تجویزین منظور ہوئین جو اخبارون مین چھپ چکی ہین،

اس جلسہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس مین سب سے پہلی دفعہ ہندوستانی کی قومی و تعلیمی حیثیت پر غور کیا گیا، اور اس کو عمل کے قابل سمجھا گیا، اور ہندوستانی زبان کی مشتبہ حقیقت کو ان لفظون مین ظاہر کیا گیا،

ہندوستانی سے مراد اس ملک کی وہ زبان ہے جو ہندو مسلمانون کے میل ملاپ سے بنی ہے، جو شمالی ہند کے باشندے عام طور سے بولتے ہین اور ہندوستان کے دوسرے حصون کے رہنے والے سمجھتے ہین، جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے نامانوس لفظون سے خالی ہو، اور جو فارسی، ناگری یا کسی دوسرے خط مین لکھی جائے،

جلسہ کی دوسری اہمیت انجمن ترقی اردو کے ناظم مولوی عبدالحق صاحب اور سہیتہ سمیلن کے صدر بابو راجندر پرشاد کا وہ متفقہ بیان ہے جس پر دونون جماعتین اگر ایمانداری سے عمل کرین تو اردو ہندی کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے،

متفقہ اعلان

انجمن ترقی اردو بہار کے ایک جلسہ مین جو ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء کو پٹنہ مین منعقد ہونے والا تھا، تاکہ ہندوستانی زبان کے متعلق مختلف مسائل پر آپس مین اور دوسرے احباب سے تبادلۂ خیالات کیا جائے، ہم چاہتے تھے کہ جو غلط فہمیان بدقسمتی سے اردو ہندی، اور ہندوستانی کے نزاع کے سلسلہ مین پیدا ہو گئی ہین وہ دور ہو جائین، اور ہمین خوشی ہے کہ اب اس بحث کے حق مین جو مختلف سوالات اٹھائے گئے تھے، ان کے بارے مین ہمین مختلف امور مین بحیثیت مجموعی اتفاق ہے،

ہمین اتفاق ہے کہ ہندوستانی زبان، ہندوستان کی مشترک زبان ہونی چاہئے اور اردو اور ناگری دونون رسم الخط مین لکھی جانی چاہئے، اور دونون رسم الخط تمام سرکاری اور تعلیمی مقاصد کے لئے تسلیم کر لینے چاہئین، ہندوستانی سے مراد ہماری وہ زبان ہے جس مین زیادہ سے زیادہ اجزا، اس زبان کے لئے جائین جو شمالی ہند مین عام طور پر بولی جاتی ہے، اس زبان مین الفاظ کے انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ اُن کا عام بول چال مین کس حد تک رواج ہے،

ہماری یہ بھی رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونون کو بحیثیت ادبی زبان کے پوری پوری ترقی کرنے کا موقع دینا چاہئے

ہم یہ بھی تجویز کرتے ہین کہ ہندی اور اردو کے ادیبون کی اعانت سے ہندوستانی زبان کے بنیادی الفاظ کا ایک لغت تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اس قسم کے لغات کی تدوین کے لئے عملی تجاویز اختیار کرنے اور دوسرے اہم مسائل مثلاً اصطلاحات علمیہ کے انتخاب کے لئے ہماری تجویز ہے کہ ایک چھوٹی سی نمایندہ کمیٹی بنائی جائے جس مین اردو اور ہندی دونون کے با اثر رکن شریک ہون، اور جو دونون زبانون کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قابل ہون اور اس طرح دونون زبانون کے بولنے والون مین زیادہ خوشگواری پیدا ہو جائے،

بنگال کسی زمانہ مین ہندوستانی زبان کا بڑا مرکز تھا، مرشد آباد اور ڈھاکہ کی ادبی کوششین بھلائی نہین جاسکتین
پھر فورٹ ولیم کالج کلکتہ مین جو کچھ ہوا وہ بنگال کے احاطہ سے باہر نہین، پچھلے زمانہ مین جب صوبہ وار قومیت کے تعصب
مین بنگال سب سے آگے تھا، اس نے ہندوستان سے اپنے پرانے تعلق کے رشتہ کو کاٹنے کی بڑی کوشش کی، اور بنگالی
زبان کے ساتھ کسی دوسری مشترک زبان کے خیال کو اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، مگر اب ہندوستان کی
چوبائی ہوا نے پوروا کو شکست دیدی ہے، اور دن پر دن یہ خیال وہان بھی پھیلتا جاتا ہے، کہ اگر ہم کو پورے ہندوستان
سے اپنا تعلق رکھنا ہے تو ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہندوستانی سے اپنا تعلق پھر جوڑنا پڑے گا، خیال کی
اس تبدیلی کی ایک بہت بڑی سند اس وقت ہمارے سامنے ہے، بنگال کی موجودہ حکومت کے وزیرون نے جب
جب ڈھاکہ مین قدم رکھا تو مشرقی بنگال و آسام کی انجمن اردو نے ان کا خیر مقدم ایک اردو سپاسنامہ کے ذریعے
کیا، اور وزیرون نے اس کو قبول کیا، اور شاید اسی زبان مین اس کا جواب بھی دیا،

اس سپاسنامہ مین ایک پارہ یہ بھی ہے،

"ہم بمسرت اظہار کرتے ہین کہ اب ملک (بنگال) مین صحیح احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ہم بنگلہ زبان
کے ساتھ اردو سے بھی رابطہ رکھ سکتے ہین، اور یہ رابطہ نہ صرف ہندوستان کے سب مسلمانون سے
ارتباط و اتحاد کا سبب ہے، بلکہ اس طرح سارے ہندوستان کے باشندون سے ہم متحد و مرتبط
ہو سکتے ہین"

خیال کی یہ تبدیلی بہت مبارک ہے،

یہ انجمن بنگال کی بہت پرانی انجمن ہے، سنہ ۱۹۰۶ء مین نواب مرحوم ڈھاکہ نے مولنا شبلی مرحوم کے ہاتھون
سے اس کی بنیاد ڈلوائی تھی،

مقالات

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان

ناظرین کو شاید یاد ہو کہ اگست سنہ ۱۹۳۳ء کے معارف مین "لاہور کے ایک فلکی آلات ساز" کے عنوان سے
میرا ایک مضمون چھپا تھا، جس مین ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الهداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری کے
اور اسکے بزرگون کے حالات اور انکے بنائے ہوئے اسطرلابون کی کیفیت اور پتے لکھے گئے تھے،

اس مضمون مین ضیاء الدین اور قائم محمد کے اسطرلابون کا ذکر تھا، اور اس وقت تک عیسیٰ اور الهداد کے
اسطرلابون کا پتہ مجھے نہین چلا تھا، تاہم مین نے قرائن سے جو باتین لکھی تھین، وہ بعد کی تحقیق سے درست
ثابت ہوئین،

اب ضیاء الدین محمد کے چچا مقیم اور دادا ملا عیسیٰ اور پردادا شیخ الهداد کے اسطرلابون کا سراغ لگا ہے،
جس سے اس خاندان کے سارے افراد کا سلسلہ پورا ہو جاتا ہے،

الهداد شیخ الهداد کو مین نے خود آلات ساز مانا تھا، اور ہمایون کا معاصر فرض کیا تھا، ہمایون کا زمانہ ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء
تک ختم ہو جاتا ہے، الهداد کا بنایا ہوا کوئی اتنا پرانا اسطرلاب تو نہین ملا ہے، لیکن سنہ ۱۹۳۴ء کے سفر حیدرآباد
مین مجھے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ مین الهداد کا بنایا ہوا ایک اسطرلاب ملا، جس پر صناع کا نام اور
تاریخ یہ درج ہے،

"صنعت استاذ الهداد اسطرلابی لاہوری فی سنہ ۹۷۵"

یہ اسطرلاب ہمایون کی وفات کے تیرہ برس بعد کا بنا ہوا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ عمل تیرہ برس کے اندر کا نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ ہمایون کا ضرور معاصر ہے، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ الہداد خود بھی آلات ساز تھا

کسٹر میوزیم ہمبرگ میں الہداد کے پوتوں کا بنایا ہوا ایک اسطرلاب ہے، جس پر ۱۰۱۸ھ کی تاریخ ثبت ہے اور چیکاگو کے ایک میوزیم میں الہداد کے بیٹے کا بنایا ہوا اسطرلاب ۱۰۱۳ھ کا ہے[1]، اس سے یہ معلوم ہوا کہ الہداد کی یہ عمر تھی، کہ ۱۰۱۳ھ میں اس کا بیٹا عیسیٰ اور ۱۰۱۸ھ میں اس کے پوتے اور عیسیٰ کے بیٹے فلکی کاریگری کے لائق ہو چکے تھے، بنا بریں ۹۷۵ھ الہداد کے بوڑھاپے کی تاریخ ہے، اور وہ ہمایون کا معاصر تھا، جس نے ۵۰ برس کی عمر میں ۹۶۳ھ میں وفات پائی ہے،

ملا عیسیٰ میرے گذشتہ مضمون کے انگریزی نسخہ پر جو اسلامک کلچر حیدر آباد (اکتوبر ۱۹۳۵ء) میں چھپا تھا ایک لائق فاضل نابیا ابات (Nabia Abbott) نے چیکاگو یونیورسٹی (امریکہ) سے ایک استدراک اسی رسالہ کے جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۴۴ میں لکھا ہے، جس میں فلکی عجائب خانہ چیکاگو (Adler Planetarium and Astronomical museum) کے دو اسطرلابوں کا ذکر کیا ہے، موصوف ہی کے حوالہ سے مجھے ایک ضروری کتاب کا علم ہوا، ایک انگریز محقق روبرٹ گنتھر (Robert T. Gunther) ناظم مجموعات لیویس یونس (آشمولین میوزیم) او کسفورڈ نے دنیا بھر کے اسطرلابوں پر دو جلدوں میں The Astrolabes of the world نام ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ہندوستانی اسطرلابوں کے باب میں چند ایسے نئے اسطرلابوں کا ذکر ہے، جن کو میں نے نہیں دیکھا، اور اس لئے ان کا ذکر میرے مضمون میں نہیں آیا، یہ کتاب انگریزی میں ۱۹۳۲ء میں یونیورسٹی پریس آکسفورڈ میں چھپی ہے، اور اس وقت میرے پیش نظر ہے، ان دونوں میں ملا عیسیٰ بن الہداد کے بنائے ہوئے اسطرلابوں کے حوالے ہیں،

[1] ان اسطرلابوں کے حوالے آگے آتے ہیں،

گنتھر نے ملا عیسیٰ کے جس اسطرلاب کا حوالہ دیا ہے (جلد ۱ ص ۱۸۲ نمبر ۶۸) اس کا علم موصوف کو سر پرسی ویبسٹر سے نومبر ۱۹۲۸ء میں ہوا، افسوس ہے کہ اس کے بننے کی تاریخ ان لوگوں نے نہیں دی ہے اور نہ اس کا فوٹو گنتھر نے چھاپا ہے، نقش کا انگریزی ترجمہ جو دیا گیا ہے، اس سے اکی اصلی عبارت یوں بنتی ہے:

"صنعت اضعف العباد عیسیٰ بن الہداد اسطرلابی لاہوری ہمایونی"

لیکن چیکاگو کے مذکورۂ بالا فلکی عجائب خانہ میں عیسیٰ کا بنایا ہوا جو اسطرلاب ہے اس پر یہ عبارت مع تاریخ درج ہے،

"صنعت اضعف العباد عیسیٰ ولد الہداد ۱۰۱۳ھ"

(اسلامک کلچر جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۴۴)

عیسیٰ کے پوتے ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا ۱۰۶۹ھ کا ایک اسطرلاب لاہور سے الجیریا (الجزائر) پہنچا، اور جولائی ۱۹۱۱ء میں ایک فرانسیسی ال یونس نے خریدا، اس کا ذکر گنتھر نے کیا ہے، (جلد ۱ ص ۲۰۸ نمبر ۷۷) اس میں ضیاء الدین نے اپنے دادا کے نام کے ساتھ "حافظ" لکھا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ حافظ قرآن بھی تھے،

لفظ اسطرلابی ہمایونی کا اضافہ بھی ان ہی عیسیٰ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ گنتھر کے اس ستھویں اسطرلاب سے ظاہر ہے،

عیسیٰ کے دو بیٹے محمد مقیم اور قائم محمد سب سے پہلے گنتھر ص ۱۸۷ نمبر ۶۹ نقش ۹۰ کا ذکر ضروری ہے اس کے عضادہ پر نسخ میں یہ عبارت کھدی ہے،

تمت بایدی اضعف العباد
ابنی عیسیٰ ابن الہداد
[illegible]ھ فی بلد دار الخلافہ
لہاور صانہ اللہ عن آفات الدہور

جنایات بر جائداد

از

جناب مولوی محمد غوث صاحب ایم اے (جامعہ عثمانیہ)

(۲)

تصرفاتِ غاصب۔ | فقہائے شوافع نے طے کیا ہے کہ

۱۔ غاصب، مالِ مغصوب میں کوئی تصرف کرے، مثلاً خرید و فروخت تو قول جدید کے لحاظ سے اس قسم کا تصرف باطل ہے،

۲۔ ایسا مشتری جسکو ہرجہ ادا کرنا پڑے بائع (غاصب) سے صرف ثمن وصول کر سکے گا،

۳۔ مشتری کے قبضہ میں نقص واقع ہو، یا اس کے استعمال کی وجہ سے کوئی نقصان پیدا ہوا ہو اور ہرجہ ادا کرنا پڑے، تو بائع (غاصب) سے اس ہرجہ کو حاصل نہ کیا جاسکیگا،

۴۔ بائع کے قبضہ میں کوئی نقص واقع ہوا ہو، اور مشتری کو اس کا ہرجہ ادا کرنا پڑے، تو بائع سے ہرجہ حاصل کیا جاسکے گا،

۵۔ تعمیر عمارت وغیرہ کی وجہ سے مشتری کو کوئی مالی نقصان برداشت کرنا پڑے تو قول اظہر یہ ہے کہ مشتری بائع سے اپنے نقصان کا ہرجہ وصول کرسکیگا،

اس مسئلہ میں انگریزی ارباب قانون نے صراحت کی ہے، کہ

ہر مشتری آراضی اس امر کا مستحق ہے، کہ تکمیل معاہدہ کے بعد جائداد کو جس کے لئے اس نے معاملہ کیا ہے، مکمل حالت میں حاصل کرے، اگر بائع یا کسی ایسے فرد کی غلطی سے جس کے لئے بائع جواب دہ ہو، جائداد کی قیمت میں نقصان آئے تو مشتری مستحق ہے کہ پورا ہرجانہ وصول کرے،

مدعی اراضی کا کرایہ بھی وصول کرسکتا ہے، | خود امام شافعی کا قول ہے کہ

"اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کا مکان غصب کیا ہو تو غاصب پر اس مکان کا کرایہ ادا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوگی، کرایہ کا معیار اس مکان کے کرایہ کو قرار دیا جائے گا، جو مکان مغصوب مکان کے مماثل ہو، کرایہ کی ذمہ داری ہر صورت میں عائد ہوگی، چاہے، غاصب سکونت اختیار کرے، یا نہ کرے، یا کرایہ پر دے، یا نہ دے، البتہ شرط یہ ہے کہ مکان مغصوب کے مماثل کوئی اور مکان کرایہ پر دیا جاتا ہو، مکان سے قطع نظر ہر اس شے کی یہی صورت ہے، جس کے ذریعہ سے آمدنی حاصل ہوسکتی ہے، چاہے غاصب اس سے رقم حاصل کرے، یا نہ کرے، اور چاہے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، غاصب پر ہر صورت میں کرایہ مماثل کی ادائی لازم ہوگی"

اس کرایہ کا آغاز قبضہ کے وقت سے ہوگا، اور اختتام واپسی کے وقت

انگریزی قانون جنایات کی رُو سے گو محض نفس مداخلت بیجا کی بناپر کرایہ کی ادائی کی ذمہ داری لازم نہیں قرار دی گئی ہے، لیکن ان صورتوں میں امام شافعی کی طرح ذمہ داری عائد کی ہے جن میں مداخلت بیجا کی نوعیت مدعی کی جائداد آراضی سے خلاف قانون تمتع کی ہوتی ہو، اگرچہ کوئی حقیقی نقصان اس صورت میں نہ ہو، مدعی کو حق ہے، کہ وہ اس تمتع کی بناپر ہرجہ کے طور پر ایک معقول معاوضہ حاصل کرے گویا کسی معاہدہ کی بناپر اس ہرجہ کو حاصل کیا جارہا ہے،

آراضی سے بے دخلی کی نوعیت، | آراضی سے بیدخلی دو طرح ہوتی ہے،

۱۔ خلاف قانون طریقہ سے قبضہ حاصل کرنے سے،

۲۔ جائز حق قبضہ ختم ہونے کے بعد ناجائز طور سے قبضہ باقی رکھنے سے مثلاً قرضہ ادا ہونے کے بعد

نک رہن سے انکار کرنا،

بے دخلی کا چارہ کار، بے دخلی کے چارۂ کار کی دو صورتیں ہیں،

غیر عدالتی، اور عدالتی،

غیر عدالتی چارہ کار، اسلامی اور انگریزی قانون دونوں میں یہ طے کیا گیا ہو کہ وہ شخص جو خلاف قانون طریقہ سے اپنی زمین سے بے دخل کر دیا گیا ہو، اس امر کا پابند نہیں ہو کہ قبضہ مکرر کے لئے عدالت ہی میں نالش دائر کرے، اگر مدعی پرامن طریقے سے بغیر قوت کا استعمال کئے ہوئے آراضی پر بطور خود قبضہ حاصل کر سکتا ہو تو اسکو یہ حق حاصل ہو،

عدالتی چارہ کار، جس طرح غصب کی تحریم پر اسلامی ائمہ کا اجماع ہے، اسی طرح مال مغصوب کے رد پر بھی اجماع ہے، البتہ اس میں یہ شرط ہے، کہ مال مغصوب موجود ہو، اور اسکے رد میں اتلاف نفس کا خوف نہ ہو،

آراضی پر جو غصب واقع ہوتا ہے، اسکی نوعیت قرار دینے میں امام اعظم اور امام شافعی میں اختلاف ہے لیکن اس کے رد میں کوئی اختلاف نہیں،

یہ اصول کہ ردّ عین ضروری ہے انگریزی قانون جنایات میں بھی یہی طے کیا گیا ہے،

واصلات اور حاصلات، امام اعظم کے نزدیک آراضی پر غصب واقع نہیں ہوتا، یا دوسرے الفاظ میں غصب (Mesne profit) کی وجہ سے آراضی سے صاحب آراضی کے قبضہ کا ازالہ نہیں ہوجاتا، اس بنا پر ان کے نزدیک مواد وعین کے مالک آراضی کو اور کوئی معاوضہ نہیں دلایا جائیگا، "ردّ عین" کا مطلب یہ ہے کہ مدعی علیہ کے فعل سے اگر آراضی میں کوئی مادی نقصان ہو تو اس کا معاوضہ دلایا جائیگا، مدعی علیہ نے سکونت وغیرہ کا جو انتفاع حاصل کیا ہو اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا، لیکن امام شافعی کے نزدیک غصب آراضی سے صاحب اراضی کے قبضہ کا ازالہ ہو جاتا ہے، اس بنا پر اگر آفت سماوی کے باعث

آراضی میں مادی نقصان پیدا ہو تو مزیل قبضہ اس کا ذمہ دار ہے، اس بارہ میں انگریزی قانون اور امام شافعی کا مذہب ہر امر میں بالکلیہ متفق ہو، اس سلسلہ میں امور ذیل کی صراحت ضروری ہو

۱- اثنائے زمانہ غصب میں جائداد سے انتفاع حاصل کیا جائے تو امام شافعی نے اس کا ہرجہ بھی لازم قرار دیا ہو، امام اعظم نے صرف "ردّ عین" (اصل شئے کا واپس کرنا) کافی قرار دیا ہو،

۲- واصلات کے متعلق امام شافعی نے قرار دیا ہے کہ مال مغصوب کی آمدنی صرف مالک ہی کا حق ہو، امام اعظم کے نزدیک وہ غاصب کا حق ہے،

ان دونوں مسائل کے متعلق انگریزی قانون کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مدعی آراضی کی بازیابی کے علاوہ اور جو معاوضہ حاصل کر سکے گا، اسکی دو قسمیں ہیں،

الف، جائداد کے ہر اس استفادہ کا معاوضہ جو مدعی علیہ نے حاصل کیا ہو،

ب، جائداد کے ہر اس مادی نقصان کا معاوضہ جو مدعی کو برداشت کرنا پڑا ہے، اس سلسلہ میں انگریزی قانون میں یہ ہے کہ اگر مدعی علیہ جائداد میں تصرف کرے، یا آراضی میں قیام کرے تو وہ اس امر کا ذمہ دار ہے، کہ اس تصرف وقیام کا مدعی کو ہرجہ ادا کرے، مدعی علیہ پر ہر صورت میں ذمہ داری عائد ہوگی، چاہے وہ خود تصرف یا قیام کرے، یا اسکی جانب سے کوئی اور شخص،

اس طرح ملحقات آراضی میں بھی قبضہ ناجائز کے وقت جو نقص پیدا ہوا اس کا معاوضہ بھی ادا کرنا لازم ہوگا، مدعی صرف اس منفعت کا معاوضہ دلانے کے لئے نالش نہیں کر سکتا جو مدعی علیہ نے آراضی سے حاصل کی ہو، یا جو مدعی نے کھو دیا ہو، بلکہ اس تمام نقصان کے ہرجہ کا مستحق ہے، جو بوجہ بیدخلی اسکو برداشت کرنا پڑا،

اس طرح واصلات اور حاصلات کے بارے میں امام شافعی کے مسلک، اور انگریزی قانون کے اصول میں کوئی فرق نہیں ہے،

۳- ازالۂ قبضہ کے بعد آراضی میں کوئی توسیع یا اصلاح عمل میں لائی جائے، تو اس صورت کیلئے انگریزی قانون میں کوئی بات قطعی طور سے طے نہیں ہوئی ہے، سر جان سامنڈ نے اپنی ذاتی رائے یہ ظاہر کی ہے، کہ مدعی کو چاہئے، کہ اسکی جائداد میں مدعیٰ علیہ کی جانب سے جو توسیع یا اصلاح عمل میں آئی ہے، اور اس جو فائدہ ہوا ہے، اس کا لحاظ ہرجہ حاصل کرنے میں کرے، اسلامی فقہاء نے اس مسئلہ میں زیادہ قطعیت ظاہر کی ہے، اور بہت تفصیل سے یہ مباحث ان کتابوں میں ہیں، امام اعظم کی اس باب میں وہی رائے ہے، جسکی سر جان سامنڈ نے رائے دی ہے، لیکن امام شافعی مدعی علیہ کے ساتھ کسی رعایت کو درست نہیں قرار دیتے،

۴- بے دخلی کے زمانہ میں اگر جائداد مسلسل یکے بعد دیگرے مختلف افراد کے قبضہ میں رہے، تو ہرجہ حاصل کرنے کے لئے انگریزی قانون جنایات میں مقرر کیا گیا ہے، کہ ہر ایک قابض پر اس کے زمانۂ قبضہ کے لحاظ سے نالش ہو سکیگی، اسلامی ارباب فقہ نے بھی اصولاً اسکو طے کیا ہے، اور عملاً وہی قواعد قرار دیئے ہیں، جو انگریزی قانون میں مقرر کئے گئے ہیں،

جنایت بر مال منقول دست اندازی محض

اس کے شرائط پر آخر میں، اشارہ کیا جائے گا، فی الوقت اسکی نوعیت متعین کر لیجاتی ہے، امام اعظم کے نزدیک کسی مال منقول پر غصب ثابت ہونے کیلئے اسکی نقل و تحویل ضروری ہے، اور پھر ازالۂ قبضہ بھی ضروری ہے، امام شافعی کے نزدیک نہ تو نقل و تحویل ضروری ہے، اور نہ ازالۂ قبضہ، صرف اثبات قبضہ کافی ہے،

اس اعتبار سے اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے گھوڑے پر مالک کی اجازت حاصل کئے بغیر سواری کرے، تو اس صورت میں امام شافعی کے نزدیک غصب ثابت ہو، امام اعظم کے نزدیک بھی غصب ثابت ہوگا، کیونکہ سواری سے تصرف ثابت ہو چکا ہے، اور اس سے مالک کے قبضہ کا ازالہ ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف فرش پر بیٹھنے کو امام اعظم نے غصب نہیں قرار دیا ہے، لیکن امام شافعی

نے اسکو بھی غصب قرار دیا ہے، امام اعظم کے نزدیک محض بیٹھنے سے کوئی نقل و تحویل عمل میں نہیں آتی اور خاطی کی نشست سے مالک کے قبضہ کا ازالہ نہیں ہوتا، فرش بچھانا مالک کا فعل ہے، اور وہ اپنے حال پر قائم ہے، امام شافعی کو اس سے اتفاق نہیں ہے، انھوں نے قرار دیا ہے کہ نشست سے قبضہ ناجائز کا اثبات ہو چکا ہے، اور وہ غصب کے لئے کافی ہے،

بہر حال امام شافعی کے مسلک کو یوں دہرایا جا سکتا ہے،

۱- مال منقول میں بھی غصب واقع ہوتا ہے،

۲- اس کا معیار اثبات قبضہ ہے،

۳- اثبات قبضہ ناجائز طور سے واقع ہونا چاہئے، (الغصب ھو الاستیلاء علی حق الغیر عدواناً)،

۴- اثبات قبضہ کا معیار نقل و تحویل ہے، لیکن ایسی اشیاء جن پر بلا نقل و حرکت و تحویل اثبات قبضہ ہو جائے مغصوب ہو جاتی ہیں،

۵- اثبات قبضہ ہو جائے، تو پھر مدعیٰ علیہ کے قصد و غیر قصد کی بحث غیر متعلق ہو جاتی ہے، انگریزی قانون میں قرار دیا گیا ہے کہ

"دوسرے کے قبضہ میں جو مال ہو، اس میں اخذ یا نقل یا کسی اور بلا واسطہ فعل سے جو نقصان پیدا کرنے کا موجب ہو خلاف قانون تصرف کرنا دست اندازی ہے"

(لاز آف انگلینڈ جلد ۲۷، ص ۱۵۶)

اسی طرح مال پر قبضہ کر لینا دست اندازی ہے، یا مال کو منتقل کرنا یا عمداً نقصان پہنچانا خواہ وہ نقصان نہایت خفیف ہی کیوں نہ ہو دست اندازی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ نقصان فعل کا براہ راست نتیجہ ہو،

سر فریڈرک پولک نے کسی اور فعل کو جو بذاتہٖ قابض کے اغراض ہیں، فوری نقصان پیدا کرنے کا باعث ہو، دست اندازی قرار دیا ہے، اور مثال میں جانوروں کو مار ڈالنا، ان کو پٹینا، ان کا بیچا کرنا یا کسی تصویر وغیرہ کے بگاڑنے کو پیش کیا ہے،

دست اندازی کیساتھ ہی اگر مال پر خاطی کا قبضہ ہو جائے، تو اسکی صورت تصرف بیجا کی ہو جاتی ہے، دست اندازی تصرف بیجا کے بغیر بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تصرف بیجا دست اندازی کے بغیر بھی عمل میں آئے،

اس طرح ظاہر ہے کہ انگریزی قانون جنایات میں بھی دست اندازی کا معیار اثبات قبضہ ہے، اس سلسلہ میں ایک قابلِ غور امر یہ ہے کہ مال پر اس طرح صرف ہاتھ رکھ دینا جس سے نہ تو قبضہ زائل ہو اور نہ کوئی مادی نقصان ہو، درحقیقت دست اندازی ہے یا نہیں، مسٹر جان سامنڈ اور مسٹر فریڈرک دونوں نے بیان کیا ہے کہ تاوقتِ تحریر ان کو اس بارے میں کسی مستند تصفیہ کا علم نہیں ہے،

دست اندازی مالِ منقولہ کا چارۂ کار، اس کی بھی دو صورتیں ہیں، غیر عدالتی اور عدالتی،

غیر عدالتی چارہ کار کی کئی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں،

الف - مال کی مدافعت،

ب - بوقتِ مدافعت قوت استعمال کرنا،

ج - مال پر بطور خود قبضہ کر لینے کا حق، اور اس کے ضمن میں قوت کا استعمال کرنا، اور آراضی غیر میں داخل ہونا،

ان میں سے ہر ایک کے متعلق مختصر توضیح بے محل نہ ہو گی،

الف، ہر وہ شخص جو مال کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا مستحق ہے، اس امر کا بھی مستحق ہے کہ مناسب قوت استعمال کر کے اپنے مال کو قبضہ میں رکھنے کیلئے دوسرے کی دست اندازی کی مدافعت کرے،

ب - مال پر امن طریقہ سے یا مناسب قوت استعمال کر کے واپس لیا جا سکتا ہے، اس طرح مال واپس لینا گو وہ استعمالِ قوت کیساتھ کیوں نہ ہو، نہ کوئی دیوانی تعدی ہے اور نہ کوئی فوجداری جرم، قوت اس حد تک جائز قرار دیجائیگی، جو بہ لحاظ ضرورت مناسب ہو،

ج - یہ امر کسی قدر مشتبہ ہے کہ مال کو واپس لینے کا جو حق ہے، اسکی بنا پر دوسرے کی آراضی میں جہاں مال واقع ہے، داخل ہونا کس حد تک درست ہے،

یہ سب انگریزی قانون کے احکام ہوئے، اسلامی فقہاء کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہے،

۲ - عدالتی چارہ کار،

واضح ہو کہ مال میں دست اندازی دو طرح سے واقع ہو سکتی ہے،

الف - مال میں محض دست اندازی عمل میں آئے، مثلاً مال پر ہاتھ رکھ دینا، اس صورت میں نہ تو قبضہ زائل ہوتا ہے اور نہ مال میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے،

ب - قبضہ زائل ہو جائے اور نقصان واقع ہو،

پہلی صورت کے متعلق انگریزی قانون میں کوئی اصول قطعی صورت میں طے نہیں ہوا ہے، پولک اور سامنڈ کی رائے میں آراضی پر قیاس کر کے یہاں بھی ہرجہ دلایا جانا چاہیئے،

ان صورتوں میں اسلامی فقہاء نے ہرجہ کا وجوب لازم نہیں قرار دیا ہے، لیکن چونکہ ان افعال سے مالِ غیر کی حرمت میں فرق آتا ہے، اس لئے سزائے تعزیری دیجا سکے گی،

دوسری صورت میں سارے اسلامی فقہاء متفق ہیں کہ عین مال بعینہٖ بلا نقصان و اضافہ موجود ہونیکی صورت میں غاصب پر یہ امر واجب ہے کہ وہ مال مالک کے سپرد کرے، البتہ یہ شرط ملحوظ رہیگی کہ مال سپرد کرنے میں اتلافِ جان کا خوف نہ ہو،

انگریزی قانون اس بارہ میں قدرے مختلف ہے، اسمیں مدعی کو اختیار دیا گیا ہے، کہ وہ چاہے تو عین

مال کی موجودگی کے باوجود قیمت وصول کرے، اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے، کہ مدعی علیہ کو اس قسم کا اختیار نہیں ہے، کہ قیمت ادا کرکے مال رکھ لے، صرف مدعی چاہے تو مال کے بجائے قیمت لے سکتا ہے، اسلامی فقہائے نے مدعی پر لازم کیا ہے، کہ مال موجود ہو تو مال ہی حاصل کرے، اوس کو قیمت لینے کا اختیار نہیں ہے،

اتلاف و تصرف بیجا

اس موقع پر یہ نکتہ واضح کر دینا ضروری ہے، کہ مال میں صریح نقص پیدا ہو جائے تو اسلامی فقہاء نے اسکو اتلاف قرار دیا ہی تصرف بیجا جس کے لئے فقہاء نے "تصرفات غاصب" کی اصطلاح مقرر کی ہے، اتلاف ہی کی ایک شکل ہے، مثلاً مال مغصوب کا ہبہ یا بیع و شری وغیرہ، اس کے برخلاف انگریزی قانون کی رو سے اگر مدعی علیہ کا یہ ارادہ ہے، کہ مال پر وہ خود قبضہ کرلے، یا مدعی کو اس سے محروم کردے، تو یہ تصرف بیجا ہے، اتلاف اسکی ایک شکل ہوگی، مال پر محض کوئی تعدی ہو تو یہ دست اندازی ہے اس صورت میں مال خود مدعی کے قبضہ میں رہتا ہے، مال مدعی ہی کے قبضہ میں رہے، اور اس میں نقص پیدا کیا جائے، تو یہ دست اندازی کی شکل ہوگی، اسلامی فقہ کے لحاظ سے یہ صورت اتلاف کی ہوگی، یا دوسرے الفاظ میں خود غصب کی،

بہرحال دست اندازی اور تصرف بیجا میں انگریزی قانون کی رو سے حد فاصل ارادہ قبضہ ہے اور اسلامی قانون کی رُو سے غصب اور اتلاف میں نقص مال حد فاصل ہے، غصب کی فقہاء نے جو جامع اور مانع تعریف کی ہے، اس فرق کی بھی ضرورت نہیں، اتلاف غصب ہی کی ایک صورت ہے،

تصرف بیجا اور اتلاف کے شرائط

اتلاف اور تصرف بیجا کے جو شرائط مقرر کئے گئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ فعل کا عمداً واقع ہونا ضروری ہے،

۲۔ فعل کے کسی بعید سبب سے مال کا نقصان واقع ہو تو اس کی وجہ سے ذمہ داری کسی طرح کم نہیں ہو جاتی،

۳۔ مدعی علیہ کے ارادہ کی نوعیت دیکھنا ضروری نہیں ہے،

۴۔ اپنی ذات کے لئے یا دوسرے شخص کے فائدہ کی غرض سے مال تلف کیا جائے تو اس صورت میں بھی ذمہ داری کسی طرح کم نہیں ہو جاتی،

۵۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مال میں جو نقص پیدا کیا جائے، وہ دائمی ہو، اسلامی فقہاء اور انگریزی ارباب قانون ان پانچوں نظریوں میں بالکلیہ متفق ہیں،

اتلاف اور تصرف بیجا کی نوعیت

اتلاف و تصرف بیجا کا فعل صادر ہونے کے لئے خواہ اسلامی فقہاء کے نقطۂ نظر سے ہو، خواہ انگریزی قانون کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عموماً غیر مجاز شخص مال پر بذریعہ اخذ تسلط حاصل کرے، بعض مرتبہ حوالگی کے انکار سے بھی اتلاف و تصرف بیجا کا وقوع عمل میں آتا ہے

۱۔ انکار حوالگی مثلاً ودیعت کے حوالہ کرنے سے انکار کرنا، اسلامی فقہاء نے قرار دیا ہے کہ

۱۔ انکار "عمداً" ہونا چاہئے یعنی مدعا علیہ کا یہ ارادہ ہونا چاہئے کہ اس کے قبضہ میں مدعی کا جو مال ہے، اس پر ناجائز طور سے قبضہ کرلے،

۲۔ اسکا معیار بالعموم طلب و انکار ہے، لیکن حکماً بھی انکار ہو سکتا ہے،

۳۔ مدعی علیہ کے مال کے استحقاق کے متعلق جائز شبہہ ہو تو پھر اس صورت میں مال روکنے کا حق ہے

۴۔ مال واپس کرنا مدعا علیہ کی قدرت سے باہر نہ ہو،

امور ۱، ۲، ۳، اور ۴ میں انگریزی قانون اسلامی قانون کے مماثل ہے، لیکن امر ۲ میں انگریزی قانون میں ابھی انکار حکمی کا اصول قطعی طور پر طے نہیں پایا ہے،

مخفی نہ رہے کہ اسلامی فقہاء نے صرف طلب و انکار ہی کی بنا پر ہرجہ کی ذمہ داری عائد نہیں کی ہے، بلکہ حکماً بھی مال کی واپسی سے انکار کئے جانے کی صورت میں بھی ذمہ داری عائد کی ہے، حکماً انکار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مدعی علیہ کے ارادہ سے یہ بات مستفاد ہوتی ہو کہ اسکا ارادہ ناجائز ہے

۲۔ دوسری صورت یعنی بذریعہ اخذ دوسرے کے مال پر تسلط حاصل کیا جائے، آراضی کے ضمن میں مداخلت بیجا مع نقصان کی نوعیت کے سلسلہ میں اسکی جو تقسیم کی گئی ہے وہی یہاں بھی قدرے رد و بدل سے منطبق ہوجاتی ہے جسکی تفصیل بہت طویل ہے،

تین اہم اصول تین اہم اصول جن سے ہرجہ کے معیار پر اثر پڑتا ہے یہ ہیں،

۱۔ غاصب کے فعل سے مال مغصوب میں تغیر واقع ہو، اور ازالہ اسم اول ہوجائے، مال کی منفعت فوت ہوجائے، تو ملک مالک زائل ہوجاتی ہے، اور غاصب کو ملکیت حاصل ہوجاتی ہے، یہ امام اعظم کا مسلک ہے امام شافعی کو اس سے اختلاف ہے، انھوں نے قرار دیا ہے، کہ مالک کی ملکیت کا ازالہ کسی حال میں نہیں ہوتا، البتہ مال کا ایسا تغیر جس پر ہلاک کا صادق آئے، اتلاف کے مماثل قرار دیا جائے گا، انگریزی قانون کی رو سے پہلے قانون روما کی متابعت میں ازالہ ملکیت ہوجاتا تھا لیکن فی زمانہ سر جان سامنڈ جیسے مشاہیر ارباب قانون کی رائے ہے، کہ ازالہ ملکیت نہیں ہوتا،

۲۔ ہرجانہ ادا کر دیا جائے تو نفس ادائی ہرجانہ سے امام اعظم کے نزدیک غاصب کو مال مغصوب پر ملکیت حاصل ہوجاتی ہے لیکن امام شافعی کو اس سے اختلاف ہے اس اختلاف کی توضیح اس مثال سے بخوبی ہوگی، کہ یہ خیال کرکے کہ مال تلف ہوچکا ہے، غاصب نے مال مغصوب کا ہرجانہ ادا کر دیا لیکن ادائی کے بعد مال برآمد ہوگیا تو اس صورت میں امام اعظم کے مسلک کے لحاظ سے مال پر غاصب کو ملکیت حاصل ہوجائیگی، اور ملکیت کا آغاز ادائی ہرجانہ کے وقت سے ہوگا، لیکن امام شافعی کے نزدیک غاصب کو ملکیت حاصل نہ ہوگی، اگر مغصوب منہ غاصب سے قیمت حاصل کر چکا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وصول شدہ قیمت واپس کرکے غاصب سے مال واپس لے لے، اس مسئلہ میں انگریزی قانون حنفی اصول کے مماثل قرار دیا گیا ہے کہ جہاں پوری قیمت حاصل کر لی جاتی ہے، وہاں بحکم فیصلۂ عدالت سامان کی ملکیت مدعی علیہ کو حاصل ہوجاتی ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح فیصلہ کرنے میں جانبین کے لئے سہولت ہے، مدعی علیہ کو کوئی بے اطمینانی

نہیں رہتی، مدعی کی دار و گیر سے اسکا بچاؤ ہوجاتا ہے، اس طرح مدعی کو بھی مال کے برآمد ہونے کے لئے طول و طویل انتظار کی ضرورت باقی نہیں رہتی،

۳۔ مال میں کوئی اضافہ عمل میں آئے اور وہ اضافہ اصلی مال سے متصل ہو مثلاً غصب کردہ چوپایہ کا بچہ تو اس اضافہ پر امام اعظم کے مسلک میں غاصب پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، امام شافعی کے نزدیک اس قسم کے اضافہ پر بھی غاصب کی ذمہ داری قائم ہوجاتی ہے،

انگریزی قانون امام شافعی کے اصول کے مماثل ہے،

امین کا استحقاق امین کے قبضہ میں کوئی مال ہو، اور اس قبضہ کی حالت میں اس مال پر کوئی جنایت وقوع میں آئے، تو فقہائے اسلام اور انگریزی قانون کا اس پر اتفاق ہے کہ امین جائداد کی پوری قیمت وصول کرنے کا مستحق ہے، اور یہ کہ امین اپنے استحقاق سے زیادہ جو رقم وصول کرے، وہ امین کے پاس اصل مالک کے حق میں امانت رہے گی،

امین ہرجہ حاصل کرے تو اس کا اثر انگریزی قانون کی رو سے مقرر کیا گیا ہے، کہ

۱۔ اگر جائداد کی پوری قیمت امین کو ادا کر دی جائے، تو قیمت ادا کرنے والا اصلی مالک کے مقابلہ میں بری الذمہ ہوجاتا ہے،

۲۔ کسی خاطی کو جو محض قابض ہے، (غاصب) جائداد کی پوری قیمت ادا کی جائے تو اصلی مالک کے مقابلہ میں برأت حاصل نہیں ہوتی،

سر جان سامنڈ کی رائے میں یہ قاعدہ ناقابل اطمینان اور باہم متخالف ہے ان کی رائے کا ماحصل یہ ہے کہ جس طرح غاصب کو اصلی مالک کے مقابلہ میں قیمت جائداد ادا کر دینے سے برأت نہیں حاصل ہو سکتی، اسی طرح دوسروں کو بھی بری الذمہ نہیں ہونا چاہئے،

امام اعظم کی رائے کے مطابق یہ شکلیں ہیں،

۱۔ امین کو مال واپس کردیا جائے، تو اصلی مالک کے مقابلہ میں برأت حاصل ہو جاتی ہے،

۲۔ مال کی قیمت کی ادائی سے بھی برأت حاصل ہو جاتی ہے،

۳۔ غاصب اور امین دونوں کو ادا کیا جانے کا ایک حکم ہے،

عصری انگریزی قانون اور امام اعظم کی رائے میں جو تطابق اور اختلاف ہے وہ یہ ہے،

۱۔ مال کی قیمت امین کو ادا کردی جائے، تو اصلی مالک کے مقابلہ مین برات حاصل ہو جاتی ہے اس بارہ میں امام اعظم اور انگریزی قانون دونوں متفق ہین،

۲۔ غاصب اور امین دونوں مین سے کسی ایک کو مال یا اوس کی قیمت ادا کرنے کا حکم امام اعظم کے نزدیک ایک ہی ہے، لیکن انگریزی قانون کے لحاظ سے غاصب کو قیمت ادا کرنے سے برات حاصل نہیں ہوتی،

امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ

۱۔ جب تک امین اصلی مالک کی جانب سے مجاز نہ ہو، اور اسکو توکیل حاصل نہ ہو، اسوقت تک اسکو یہ حق نہیں ہے کہ ردّ عین کا دعوی کرے،

۲۔ غاصب کو مال واپس کردیا جائے، تو اصلی مالک کے مقابلہ میں برأت حاصل نہ ہوگی، یہ حکم ردّ عین کے لحاظ سے ہے، لیکن اسکو ادائی قیمت سے بھی متعلق کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے،

انگریزی قانون اور امام شافعی کی رائے میں جو توافق اور اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ،

۱۔ اگر غاصب کو مال لوٹایا جائے، تو اس صورت میں اصلی مالک کے مقابلہ میں برأت حاصل نہیں ہوگی، اس بارے میں امام شافعی کے مسلک اور انگریزی قانون میں پورا توافق ہے،

۲۔ باقی صورتوں میں امام شافعی نے اذن مالک اور توکیل ضروری قرار دی ہے، انگریزی قانون کے لحاظ سے بعض صورتوں مثلاً رہن میں بلا توکیل و اذن رد ہو سکتا ہے، لیکن بعض صورتوں

میں جیسے کہ ملتقط کی صورت ہے قانون معیّن نہیں ہے،

مسٹر جان سامنڈ نے انگریزی قانون کی نسبت جو بے اطمینانی ظاہر کی ہے، اور اسکو پیچیدہ قرار دیا ہے اس کا حل امام شافعی کے مسلک سے ہو جاتا ہے، کہ جن صورتوں میں مالک کا اذن و توکیل حاصل ہو، ان میں برآت حاصل ہو جاتی ہے اور جن صورتون میں اذن و توکیل حاصل نہ ہو ان میں نہیں ہوتی،

معیار ہرجہ کے متعلق بعض اصول

معیار ہرجہ پر غور کرنے سے قبل دو امور کو صاف کرنا ضروری ہے:۔

۱۔ آیا ہرجہ ردّ عین کا بدل ہے،

۲۔ آیا مدعی کو اختیار رہے کہ اس عین شے کی موجودگی کے باوجود ردّ عین یا اسکی مساوی قیمت کے لئے نالش کرے،

امر اول کے متعلق واضح ہو کہ انگریزی قانون میں قرار دیا گیا ہے کہ ہرجہ ردّ عین کا بدل ہے، امام اعظم اور امام شافعی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہے، لیکن ان کے نزدیک ضابطہ یہ ہے کہ عروض، حیوانات اور ہر وہ مال جو غیر کیلی (جو ناپا نہ جا سکے) اور غیر وزنی (جس کا وزن نہ کیا جا سکے) ہے، اسکا ہرجہ قیمت ہے، کیلی اور وزنی مال کا ہرجہ بالمثل مقرر ہے، ساتھ ہی یہ امر بھی متفق علیہ ہے، کہ اگر اس مال کا مثل نہ ہو، تو اس حالت میں غاصب پر بھی قیمت کی ادائی ہی واجب ہوگی،

امر دوم کے سلسلہ میں انگریزی قانون نے مدعی کو اختیار دیا ہے، کہ عین شے کی موجودگی کے باوجود، ردّ عین یا اسکی مساوی قیمت کے لئے نالش رجوع کرے، ردّ عین عدالت کی صوابدید پر منحصر ہے، مدعی ردّ عین کا دعوی بطور حق نہیں کر سکتا، اگر عدالت ردّ عین کا حکم صادر کردے، تو مدعا علیہ کو قیمت ادا کرنے کا پھر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا،

لیکن اسلامی فقہا نے مدعی کے لئے ایسا کوئی حق تسلیم نہیں کیا ہے اور نہ ردّ عین کو عدالت

کی صوابدید پر چھوڑا ہے، مال اگر موجود ہے تو ہر حالت میں ردّ عین ضروری ہے، سارے اسلامی فقہاء اس امر میں بالکلیہ متفق ہیں،

قیمت وصول کرنے کا معیار مال تلف ہونے کے بعد اسکی قیمت کو بطور ہرجہ ادا کرنے کے بارے میں کہ کس معیار سے اوسکی ادائی عمل میں آئیگی، باہم بہت اختلاف ہے،

انگریزی قانون کی رو سے تصرف بیجا کی نالش میں جو قیمت وصول کیجاتی ہے وہ عموماً مال کی وہ قیمت ہوتی ہے جو تصرف بیجا کے وقت مقرر تھی، وہ نہیں ہوتی جو تصرفات بیجا سے قبل مقرر تھی، یا بعد میں قرار پائی،

امام اعظم کے نزدیک مثلی اشیاء میں ادائی قیمت کو یوم خصومت کی قیمت کے مساوی ہونا چاہئے اور غیر مثلی اشیاء میں جو مال عددیات متفاوتہ کی جنس سے ہو اس میں انگریزی قانون کی طرح ادائی قیمت کے مساوی ہونا چاہئے،

امام شافعی نے مثلی مال کی صورت میں یہ قرار دیا ہے کہ وقت غصب سے حصول مثل میں دشواری پیدا ہونے کے درمیان مال کی جو زیادہ سے زیادہ قیمت قرار پائی ہو، اسکو ادا کرنا ہوگا مثلاً غصب کے وقت مثلی شے کی قیمت دس درہم تھی، تعذر مثل کے وقت اسکی قیمت ۱۵ درہم ہوگئی، تو ۱۵ درہم ادا کرنا ہوگا، اس طرح غیر مثلی شے کے ہرجہ میں وہ قیمت ادا کرنی ہوگی جو وقت غصب سے وقت تلف تک زیادہ سے زیادہ مقرر ہوئی تھی مثلاً غصب کے وقت مال مغصوبہ کی قیمت پانچ درہم تھی، اور تلف کے وقت دس درہم لیکن غصب اور اتلاف کے درمیان اسکی قیمت (۲۰) درہم ہوگئی تھی، تو ہرجہ ۲۰ درہم ادا کرنا ضروری ہوگا،

قیمت کا اتار چڑھاؤ جمہور اسلامی فقہاء نے محض قیمت کے اتار چڑھاؤ کو ہرجہ کی ذمہ داری کا سبب نہیں قرار دیا ہے چنانچہ جب تک مال کے اجزاء یا صفات میں کوئی نقص نہ پیدا ہو محض قیمت کے اتار

چڑھاؤ کی بنا پر ہرجہ لازم نہ ہوگا، اس کے برعکس انگریزی قانون میں قیمت کے اتار چڑھاؤ کو بھی قابل ذمہ داری قرار دیا گیا ہے، البتہ مال کے تلف ہو جانے یا اوس میں نقص پیدا کئے جانے کی صورت میں امام شافعی نے قیمت کے اتار چڑھاؤ کا لحاظ رکھا ہے،

مخفی نہ رہے کہ امام ابو ثور نے جن کا شمار اجلۂ شوافع میں ہے قیمت کے نقص کو بھی قابل ادائی ہرجہ قرار دیا ہے،

خاتمہ اس مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ حقوق جائداد کی حفاظت کے لئے اسلامی فقہائے صدیوں قبل جو قواعد مقرر کئے تھے، وہ علمی حیثیت سے موجودہ ترقی یافتہ دور کے ایک ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ قانون سے کسی طرح کم نہیں ہیں، بلکہ بعض صورتوں میں جدید قانون میں جو پیچیدگیاں باقی ہیں، انکا اسلامی قانون میں کوئی پتہ نہیں، بعض مسائل میں جدید قانون ابھی تک مذبذب ہے، اس میں شبہ نہیں کہ ان صورتوں میں اسلامی فقہاء میں بھی اختلاف ہے، لیکن عصر حاضر میں ان مسائل کو حل کرنے میں سلف کی فقہاء کے خیالات اور آراء سے کافی مدد ملیگی،

ان مسائل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ کے بنیادی اصول اور قواعد کلیہ کسی جامد نظام قانون کے اصول و قواعد نہیں ہیں، بلکہ اسلامی قانون کے نظام میں پھیلنے، ترقی کرنے اور زمانہ کا ساتھ دینے کی استعداد موجود ہے، اصول قانون اسلام اس قدر وسیع ہیں کہ ان سے امام اعظم اور امام شافعی جیسے مختلف الرائے اماموں کو اپنے اپنے ذوق اور خیالات و آراء کے لحاظ سے اجتہاد کرنے میں مطلق کوئی دقت پیش نہیں آئی بعض بعض مسائل میں دونوں اماموں کے زاویہ نظر اور طریقہ استنباط میں بعد المشرقین ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے ان کے قرار دادہ اصول و ضوابط شریعت اسلامیہ کے دائرہ سے قطعاً باہر نہیں ہوتے اصول قانون اسلام کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انکی مدد سے اس ترقی یافتہ زمانہ کے ایک ترقی یافتہ قانون کے اصول بلکہ بیشتر عملی صورتیں بھی حل ہو سکتی ہیں

انگریزی قانون جنایات کے جس حصہ کا ہم نے مطالعہ کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ عموماً شافعی فقہ کے مماثل ہے، جہاں مختلف ہے وہاں وہ امام اعظم کی رائے کے مطابق ہے، صرف دو ایک صورتوں میں انگریزی مقننوں کی رائے دونوں اماموں کی رائے سے جدا ہے لیکن اس میں بھی ایک جگہ امام ابو ثور اور ایک جگہ امام ابو یوسف نے وہی رائے ظاہر کی ہے جس پر اب انگریزی قانون کا عملدرآمد ہے،

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک قانون سے دوسرے قانون کے بعض مسائل میں تطابق ہو سکتا ہے، اس لحاظ سے جب تک ایک پورے نظام قانون کا دوسرے پورے نظام قانون سے مقابلہ نہ کیا جائے اس وقت تک کسی قانون کے عملی افادہ کا اندازہ نہیں ہو سکتا، قانون کے سارے جزئیات کا تقابل بہت مشکل ہے، دو نظامہائے قانون کے تقابل کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں کے اصل الاصول میں تقابل کیا جائے، ایک کے فلسفہ قانون سے دوسرے کے فلسفہ قانون کا موازنہ کیا جائے، اس موازنے سے ایک نظام قانون کا فرق دوسرے نظام قانون سے ممیز ہو سکے گا، اور ہر ایک کے بنیادی اصول کا پتہ چل سکے گا، اور اس سے معلوم ہوگا، کہ کس نظام قانون میں زیادہ لچک اور عملی حیثیت سے کون سا نظام قانون زیادہ مفید ہے،

یہ کام بہت مشکل اور اس کے لئے بہت وقت اور بڑی ہمت کی ضرورت ہے، اللہ قادر و توانا اس نقش اول کے بعد اس بڑے کام کی تکمیل کا سامان بھی کر سکتا ہے، وعلیہ التکلان،

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل ایسا تبصرہ ہے، جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، حجم ۴۰۰ صفحے قیمت ہے ”منیجر“

لطیفۂ فیاضی

از

جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی

جولائی ۱۹۳۶ء کے معارف میں ایک مضمون ”لطیفۂ فیضی“ کے عنوان سے مولوی خواجہ سید رشید الدین صاحب مودودی (لکھنو) کا نظر سے گذرا، مضمون کے آخر میں صاحب موصوف نے خواہش کی ہے کہ اگر اس کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ کسی صاحب علم کے پاس ہو، یا کسی علم دوست کی نظر سے گذرا ہو تو مطلع کریں، ”حسب ذیل مضمون اس خواہش کی تکمیل کے لئے ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے،

کتاب کا نام اور سنہ ترتیب، | دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ[1] (حیدرآباد دکن) کے کتب خانے میں ایک نسخہ ”لطیفہ فیاضی“ کے نام سے موجود ہے، کتاب کا نام خواجہ سید رشید الدین صاحب نے ”لطیفہ فیضی“ لکھا ہے، دفتر دیوانی کے نسخہ میں ”لطیفہ فیاضی“ درج ہے، اس مخطوطہ کے شروع میں مرتب نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں اس طرح مذکور ہے:-

”...... بہ لطیفۂ فیاضی کہ تاریخ انجام و انتظام این مطلب اہم است، موسوم ساختہ دست ہمت بدامن شاہد مقصود میزند،......“

[1] حکومت نظام کا دفتر دیوانی و ملکی و مال وغیرہ برطانوی ہند کے ریکارڈ آفس کے مماثل ہے، اس دفتر میں سلطنت آصفیہ کے قدیم اسناد محفوظ ہیں، اور ایک کتب خانہ بھی اس سے متعلق ہے جس میں بہت سے کمیاب اور نایاب مخطوطات مخزون ہیں،

فیضی کا پورا نام شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی ہے اس لحاظ سے لطیفہ فیاضی بھی ہو سکتا ہی دو

اس نام کی اصل وجہ یہ ہی کہ اس سے تاریخ ترتیب برآمد ہوتی ہے، اس لحاظ سے سنہ ترتیب سنہ ۱۰۳۵ھ

قرار پاتا ہی، برٹش میوزیم کٹیلاگ جلد دوم صفحہ (۷۹۲) پر فیضی کے مکتوبات کے مجموعہ کا نام لطیفہ فیاضی

ہی لکھا ہے، اور تاریخ ترتیب بھی سنہ ۱۰۳۵ھ ہی بتلائی ہے، دربار اکبری میں بھی انشائے فیضی کا

نام لطیفہ فیاضی ہی، سنہ ترتیب سنہ ۱۰۳۵ھ درج ہے،

مرتب کا نام، | مرتب کا نام نورالدین محمد عبد اللہ ہے، اور یہ حکیم عین الملک کے بیٹے تھے، جو دربار اکبری

کے پنج صدی[1] کے منصبداروں میں تھے، مولوی رشید الدین صاحب نے لکھا ہی:-

"لطیفہ فیضی کا جامع نورالدین محمد عبد اللہ حکیم عین الملک شیرازی ہے،

اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ مضمون نگار محمد عبد اللہ اور عین الملک کو ایک ہی

شخصیت خیال کرتے ہیں، اور شاید عام طور پر ایسا ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن مستند تاریخوں کے مطالعہ

سے پتہ چلتا ہی کہ حکیم عین الملک کے فرزند نورالدین محمد عبد اللہ تھے، برٹش میوزیم کٹیلاگ جلد دوم میں

بحوالہ بدایونی آئین اکبری وغیرہ نورالدین محمد عبد اللہ کو عین الملک کا بیٹا لکھا ہی،

دربار اکبری سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے، ان خارجی شہادتوں کے علاوہ داخلی شہادت

بھی زیر نظر مجموعہ کی پہلی عرضی میں حسب ذیل عبارت کی شکل میں نظر آتی ہے:-

"حکیم عین الملک نقش دہلی دارد، ودرخدمت روضہ مقدسہ ومقامات پیران دہلی،

وخدمت فقرا وحسن سلوک بردم تقصیر نمی کند، وگوجران راہزن حاضر باشند ومتعہد

شدہ اند، کہ دزدی نشود، و پسرش عبد اللہ جوان رشید است ہموارہ درخدمت

پادشاہی می باشد...."

[1] مآثر الامرا کے لحاظ سے،

مرتب فیضی کا بھانجا تھا، | نورالدین محمد عبد اللہ فیضی کے بھانجے ہوتے تھے، جس کا ثبوت ان کی تحریر سے

جو دیباچہ کتاب میں شامل ہے، ظاہر ہوتا ہے، ابوالفضل اور فیضی کا ذکر کرتے ہوئے، وہ لکھتے ہیں:-

"این کمترین نسبت خواہرزادگی وتلمذی بل فرزندی بحضرات مذکورہ داشت"

مخطوطہ کی ظاہری حالت | زیر نظر مخطوطہ ۱۶ سطری مسطر پر لکھا گیا ہے، صفحات کی مجموعی تعداد ۱۰۰ ہے، اور

تقطیع ۸ ر ۱۵ انچ ہے، کتاب کا آغاز اس طرح ہوا ہے:-[1]

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا نور رخک فوق النظر حسنک فوق الثنا

اور ختم ذیل کی عبارت پر ہوتا ہی:-

"....ترانہ قال وشور غزل نمک خوان شوق روند قصیدہ بازوی صبر،...."

ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہی:-

"لطائف شیخ ابوالفضل فیضی فیاضی، بتاریخ بستم شہر جمادی الاول سنہ ۱۰۹۹ من ہجریۃ

النبویہ الف الف الصلوٰۃ والتحیۃ کتاب المذنب العاصی ذرہ خاک ہیچمقدار محمد مراد

بن قاضی عبد اللہ استرابادی نوشتہ بماند سیہ وسفید، نویسندہ را نیز فردا امید"

یہ نسخہ معمولی نستعلیق خط میں محمد مراد بن قاضی عبد اللہ استرآبادی نے سنہ ۱۰۹۹ میں لکھا ہے، اور

اکثر مقامات پر مکتوب کے شروع میں جگہ چھوڑ دی ہے، شاید یہاں سرخی سے مکتوب الیہم کے نام

لکھنا پیش نظر تھا، لیکن اس کا موقع نہیں ملا، اسلئے اب یہ نقص باقی رہ گیا، کیونکہ جن اصحاب کو یہ

مکاتیب لکھے گئے ہیں، ان کا نام نہیں معلوم ہو سکتا،

تقسیم مضامین | زیر نظر مجموعہ میں پانچ لطائف اور تین منطوقات شامل ہیں، جن کا ذکر ذیل کے الفاظ

میں درج کیا گیا ہی،

[1] برٹش میوزیم کٹیلاگ جلد دوم ص ۹۲، میں جس نسخہ کا ذکر ہے، وہ بھی بالکل اس طرح شروع ہوتا ہی،

"لطیفہ اوّل عرائض والا درگاہ،

لطیفہ دوم، مفاوضات فیاضی شرفا، وعلما، وغربا،

لطیفہ سوم، بحکماے معاصر،

لطیفہ چہارم، بسلاطین وامراءِ عظام،

لطیفہ پنجم، بہ نیاک راخوان واقارب،

منقوطہ اوّل، مناجات فائض البرکات، علاّمی وفہامی،

منقوطہ دوم، رقعات لطائف نکات خیر الانامی،

منقوطہ سیوم، مکاتیب متفرقہ کہ اعزہ واقارب شیخ فیضی نوشتہ اند"

کتاب کے شروع مین مرتب کی طرف سے ایک دیباچہ ہی، جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے

جو شروع اس طرح،

یا ازلی الظھور یا ابدی الخفا   نورک فوق النظر حسنک فوق الثنا

اور ختم یوں ہوتا ہی،

در دلم آمد کہ گنہ کردہ ام،   یکں ورق چند سیہ کردہ ام،

اس کے بعد پانچ صفحے خطبہ کتاب دیوان ابوالفیض فیضی فیاضی" کے زیر عنوان درج ہیں، جو

یوں شروع ہوتا ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،   گنج ازل راست طلسم قدیم،

اور ختم اس طرح ہوتا ہے،

خواہم کہ کشم زلاجوردش رقمے   انگاز شنگرف دہم تولش،

اس کے بعد اصل کتاب بعنوان" لطیفہ اوّل عرایض والا درگاہ شہنشاہ اکبر بادشاہ" شروع

ہوتی ہی، پہلی عرضداشت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے،:-

"عرضداشت ذرہ ہیچتر از ہیچ فیضی......

اور ختم اس دعائیہ رباعی پر ہوتی ہے،

"یارب شہِ خیل کامیاباں باشی،   فرمان دہِ آسمان خیاباں باشی،

تا سایہ وآفتاب باشند بہم   در سایۂ آفتاب تاباں باشی"

دوسری طرف عرضداشت کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے،

"مشتے خاک سرگردان فیض بجمیع ذرات موجود...."

اور اس کا اختتام یوں ہوتا ہی:-

"روشن دلان تختِ صبح گاہی آمین آمین"

تیسری عرضداشت اسطرح شروع ہوتی ہے،

"ذرہ ہیچ تر از ہیچ کہ نام خود را مکرر در بساط عظمت وجلال"

اور ختم یوں ہوتی ہے،:-

"عمر تو چوں بخت تو جاوید باد"

اس کے بعد لطیفہ دوم شروع ہوتا ہی، جس میں وہ خطوط درج ہیں، جو فیضی نے علماء و فضلاء

کو لکھے ہیں، لیکن چونکہ عنوان درج نہیں ہیں، اسلئے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ یہ خطوط کن کن شخصیتوں

کے نام لکھے گئے ہیں،

پہلی عرضداشت دربار اکبری میں فیضی کے بیان میں درج ہی، اور ایلیٹ نے واقعات

فیضی کے عنوان کے تحت جلد ششم صفحہ ۵۴۴ میں اس عرضداشت کا ترجمہ درج کیا ہے،

فیضی اور اکبر: فیضی شیخ مبارک کا بیٹا اور ابوالفضل کا بھائی تھا گو کہ اسکے حصہ میں خاندانی تمول نہ آیا تھا

اور وہ ایک غریب گھرانہ میں پیدا ہوا تھا، لیکن مثل اپنے بھائی کے غیر معمولی فریس وذہین تھا، اس کے اشعار کی بہت جلد دھوم مچ گئی، اور اکبر جیسے سخن سنج اور علم پرور شہنشاہ نے اس کو درباری شاعر کا امتیاز بخشا، اور ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا،

اکبر سارے ہندوستان کو اپنے زیر نگین دیکھنا چاہتا تھا، دکن دور تھا، اور اس کے حکمراں اور بادشاہ اس دوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا دامن سلطنت دہلی سے باندھنا نہ چاہتے تھے، گر اکبر کو ہمیشہ اسکی فکر تھی، کہ کسی نہ کسی طرح اس کا تسلط دکن پر ہو جائے، اس سلسلہ میں اس نے بعض امراء کو دکن کے بعض علاقوں میں بھیجا،

دکن کی سفارت

۲۴ رجمادی الاول ۹۹۹ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۵۹۱ء کو اکبر اعظم کا چھتیسواں سال جلوس شروع ہوا،

ماہ شوال[1] میں چار ملازمان سلطنت دکن کے چار سلاطین کی طرف پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کئے گئے، سلطان الشعراء فیضی راجہ علی خان کے دربار میں بھیجا گیا، جو برہان پور کا راجہ تھا، خواجہ امین الدین برہان الملک کے ہاں احمد نگر روانہ کیا گیا، میر محمد امین، عادل خان کی طرف روانہ کیا گیا، جو بیجاپور کا حکمران تھا، اور میر مرزا قطب الملک کی طرف گولکنڈہ بھیجے گئے، فیضی کو جب اس کام سے فراغت حاصل ہو چکی، تو بعد میں برہان الملک کی طرف بھی جانے کے لئے حکم دیا گیا،

(تاریخ ایلیٹ جلد پنجم صفحہ (۴۶۰) بضمن طبقات اکبری،)

فیضی نے دکن پہنچکر جو حالات دیکھے خصوصاً راجہ علی خان کے متعلق جو حالات معلوم کئے ان کو شہنشاہ کی خدمت میں لکھ بھیجا، اور زیر نظر نسخہ میں جو عرضداشتیں شروع میں شامل ہیں، وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں،

[1] فیضی کی عمر اس وقت تقریباً ۴۵ سال تھی،

دربار اکبری میں ۳۶۴ صفحہ پر لکھا ہے:-

"....... اسلئے ۹۹۹ھ، ۱۵۹۱ء میں ایک ایک امیر دانا کو ہر ایک کے پاس بھیجا، راجی علی خان حاکم خاندیس کی سفارت شیخ (فیضی) کے سپرد ہوئی، برہان الملک کی فہمائش امین الدین کے نام ہوئی، شیخ ابوالفضل کی تجویز سے قرار پایا، کہ راجی علی خان کے کام سے فارغ ہوکر شیخ فیضی اور امین الدین برہان الملک کے پاس جائیں،....."

"میں نے فیضی کی وہ عرض داشتیں دیکھیں جو اس نے وہاں پہونچ کر اکبر کو لکھی تھیں"

ایک برس آٹھ مہینہ چودہ دن میں دونوں سفارتوں کا سرانجام کرکے ۱۰۰۱ھ میں فیضی واپس ہوا، تعجب یہ ہے کہ برہان الملک پر اس کا جادو نہ چلا، بلکہ جو پیشکش بھیجے، وہ بھی مناسب حال نہ تھے، راجہ علی خان تجربہ کار بڈھا تھا، اس نے اعلیٰ درجہ کے تحایف بھیجے، اور بہت عجز وانکسار کے مضامین عرایض میں لکھے، یہاں تک کہ شاہانہ چیزوں کے ساتھ اپنی بیٹی بھی سلیم کے لئے بھیج دی،

ایلیٹ کی رائے،

ایلیٹ اپنی تاریخ جلد ششم ص ۱۴۷ میں فیضی کی اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے

"اس کتاب میں سوائے فیضی کے نام کے اور کوئی بات قابل لحاظ نہیں ہے، اس میں وہ معروضے درج ہیں، جو فیضی نے دکن سے شہنشاہ اکبر کے نام لکھے ہیں، جبکہ وہ چھتیسویں سنہ جلوس میں سفیر کی حیثیت سے دکن بھیجا گیا تھا، ان خطوط میں جابجا اشعار درج ہیں، اس زمانے کے سیاسی تعلقات پر ان سے بہت کم روشنی پڑتی ہے،....."

"فیضی کو مورخ نہیں خیال کیا جاسکتا،......"

ایلیٹ کی رائے پر تنقید

ایلیٹ کا یہ قول صحیح ہے، کہ فیضی کو دنیا ملک الشعراء کی حیثیت سے جانتی ہے، اور اس کا نام اس وجہ سے زندہ ہے کہ اور رہے گا اور یہ کہ وہ مورخ نہیں تھا، بلاشبہہ اسکو تاریخ نویسی اور سیاست میں دخل نہ تھا، لیکن اس سے یہ نتیجہ کس طرح نکالا جاسکتا ہے، کہ اسکے خطوط

کوئی اہمیت نہیں رکھتے، خطوط کو جانچنے کا معیار تاریخ اور سیاست ہی نہیں ہے، بلکہ ان پر تنقید کرتے وقت دوسری اور باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیا کوئی ایسے خطوط کو نظر انداز کر سکتا ہے جن میں معاشی یا اقتصادی حالات درج ہوں، درباروں کی تفصیل پیش کی گئی ہو، آداب، تہذیب و تمدن کا ذکر ہو، رعایا اور راعی کی دولت و افلاس کا اندازہ کیا گیا ہو، اطاعت و سرکشی کے آثار نمایاں کئے گئے ہوں، صنعت و حرفت پیداوار کی تفصیل مذکور ہو، اور مشاہیر، علماء، فضلاء، اور قابل ذکر لوگوں کا تعارف ہو، اگر اس قسم کے خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، تو "لطیفۂ فیاضی" بھی طاق نسیاں پر نہیں رکھی جا سکتی، کیونکہ اسمیں یہی سب کچھ ہے،

ایلیٹ صاحب چاہتے ہوں گے، کہ فیضی راجگان و سلاطین دکن کی سیاسی اقتدار، ان کی سلطنت کی اہمیت، طریقۂ حکومت، مملکت مغلیہ سے چشمک اور ان کے اقتدار سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی پوشیدہ تدبیریں ان کی فوجی طاقت اور ان کے آپس کے تعلقات کو تفصیل کیساتھ بیان کرے، لیکن ایلیٹ کا ایک ملک الشعراء سے یہ توقع رکھنا کتنا موزون اور کتنا برمحل تھا، اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے، ایسے حالات میں اگر انھیں اپنی امیدوں میں ناکامی ہوئی ہو تو یہ ان کا اپنا قصور ہے فیضی کو مورد الزام نہیں بنایا جا سکتا، ہاں اگر عبد القادر بدایونی اس مہم پر روانہ کئے جاتے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایلیٹ کی توقعات پوری ہو سکتی تھیں،

اکبر کے دربار میں بھی فیضی نے کبھی سیاسی الجھنوں میں اپنے آپ کو مبتلا نہ کیا اور وہ ہمیشہ اس ماحول میں رہ کر بھی ان سے پرے ہی رہا ایسا کیوں کیا، اسکی طبیعت اس طرح کی تھی، افتادِ طبع ایسی ہی واقع ہوئی تھی، اور رجحان کچھ اسی قسم کا تھا، یہ اسکی فطرت تھی، اور فطرت کے خلاف کوئی فریس ہستی ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتی،

"لطیفۂ فیاضی" کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ اکبر اعظم کے دربار کے ایک بے نظیر شاعر اور ایک

قادر التحریر انشاء پرداز ایک غیر معمولی فریس، اور ایک اکبر کے منہ چڑھے نورتن کے خطوط ہیں، اور اس وجہ سے بھی کہ خطوط میں بے تکلفی کی جھلک ہوتی ہے اور دوسروں کے متعلق اس سے دلی خیالات کا اظہار ہوتا ہے، کہ وہ منظر عام پر آنے کے لئے نہیں لکھے جاتے، اور ان میں کاتب کی اصلی شخصیت بہ نسبت دوسری تحریروں کے زیادہ نمایاں ہوتی ہے، اس لحاظ سے لطیفۂ فیاضی باقی رکھنے کی چیز ہے، یہ ضرور ہے کہ اسکی وہ اہمیت نہیں ہو سکتی، جو فیضی کے اشعار کی، کیونکہ بلاشبہ وہ شاعر تھا، اور صرف شاعر، لیکن لطیفۂ فیاضی میں دوسری باتوں کے علاوہ دو خصوصیتیں اس ضمن میں قابل لحاظ ہیں، ایک یہ کہ اس میں فیضی نے نثر میں شاعری کی ہے، اور اس کا اندازہ صرف مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اور دوسرے یہ کہ جا بجا اپنے اشعار سے رقعات کو مزین کرتا گیا ہے، کلام فیضی کی تحقیق و تلاش میں اس طرح بھی یہ نسخہ کار آمد ہو سکتا ہے، بعض بعض جگہ اوس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حافظ کے کسی شعر سے یا غزل سے اس کو مندرجہ غزل کہنے کی فکر ہوئی، یا یہ کہ کسی دلفریب منظر کو دیکھ کر اس کے دل میں وجدانی کیفیت پیدا ہوئی، یا شہنشاہ کی جدائی کا خیال کر کے اوس نے کچھ اشعار موزوں کئے، اکبر جیسی ہر دلعزیز ہستی، اور اس کے سرپرست شہنشاہ کی خصوصیات اور خصائل کا خیال قصیدہ نوک زبان پر لائے، بغیر نہیں رہ سکتا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں، کہ بلاشبہ فیضی پر کام کرنے والوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہیں،

آزاد کی تائید: دربار اکبری میں صفحہ (۳۷۴) طبع شدہ دار الاشاعت پنجاب ۱۸۹۸ء میں آزاد نے اپنی رائے یوں درج کی ہے: -

"یہ عرضیاں بڑی غور طلب رپورٹیں ہیں، کہ رموز سلطنت پر مشتمل ہیں، ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں بڑے بڑے نکتے سکھاتی ہیں، اول عجز و انکسار کے انداز اور مجھے اس میں جاننے کے قابل امر یہ ہے، کہ جب ہم ایشیا میں ہیں، اور ہمارے آقا کمال شوق سے آداب

تعظیم کے خریدار تو ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے میں کیا عذر ہے.....!"

فقط ایک خاکساری کا مضمون ہے جسے وہ انشاپرداز معنی آفرین کس کس طرح رنگ بدلکر پیش کرتا ہے؛

"خدمت حضور سے جدائی کا رنج بھی بہت ہوا اسے کس کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے، پہلی عرضی میں اول راستہ کی حالت اپنی مملکت میں جس جس شہر سے گذرا ہے، وہاں کی روداد حاکم کی کیفیت کارروائی، اگر ضروری ہے، تو ماتحتوں کی بھی خدمت گذاری ملک دکن میں پہنچے تو سرزمین کی کیفیت ملک کی حالت، ہر ایک مقام کی پیداوار، پھول پھل کیا کیا ہیں، اُن کیسے ہیں، اہل صنعت کے صنائع، علما، حکما، شعرا، وغیرہ اہل کمال کے حالات انکی شاگردی کا سلسلہ، کہ کن استادوں تک پہنچتا ہے، ہر ایک کی لیاقت اخلاق اطوار ہر ایک پر اپنی رائے، کہ کون پرانی لکیر کا فقیر ہے، کون نئی روشنی سے اثر پذیر ہے، اور کون ان میں سے حضوری دربار کے قابل ہے،

بعض لنگرگاہیں وہاں سے قریب ہیں، معلوم ہوتا ہے، کہ انھوں نے جاتے ہی سب طرف اپنے آدمی پھیلائے تھے، چنانچہ عرضی میں لکھتے ہیں، کہ میرا آدمی خبر لایا، فلاں تاریخ فرنگ کا جہاز اترا، فلاں اشخاص روم کے ہیں، وہاں کے حالات یہ معلوم ہوئے، فلاں جہاز آیا، بندر عباس سے فلاں فلاں اشخاص سوار ہوئے، ایران کے فلاں فلاں اشخاص ہیں، وہاں کے یہ حالات ہیں، عبداللہ خان ازبک سے ہرات پر لڑائی ہوئی، یہ تفصیل ہے، اور یہ انجام ہوا، آیندہ یہ ارادہ ہے، شاہ عباس نے تحائف تیار کئے ہیں، فلاں شخص کو ایلچی قرار دیکر حضور میں بھیجے گا، وہاں فلاں فلاں اشخاص عالم اور صاحب فضل و کمال ہیں،

عرائض مذکورۂ اکبر کی طبیعت کا حال معلوم ہوتا ہے، کہ کن کن باتوں سے خوش ہوتا تھا،

اور باوجود سامان شہنشاہی کے ان اہل علم اور اہل دانش کے ساتھ کس درجہ بے تکلف تھا، اور کیسی لطافت سے اسے خوش کرتے تھے، اور کس درجہ کی ظرافت لطافت ہوتی ہے، جو اس کے دل کو شگفتہ کرتی تھی، ان لطیفوں میں تم کو ایک نکتہ معلوم ہوگا، جو کہ مصلحت ملکی اور قانون حکمت سے آگاہ کردے گا، وہ کیا کمبخت اور منحوس جھگڑا تشیع اور تسنن کا تم دیکھ چکے، کہ علما و امراے دربار تمام بخاری اور سمرقندی تھے، اور کیسے زوروں پر چڑھے ہوئے تھے، مگر دیکھو گے اور سمجھو گے، کہ انھوں نے اس معاملہ کو کیسا خفیف کر دیا تھا کہ دل لگی کا مصالح ہو گیا"

مشتے نمونے از خروارے

اب ہم اپنے اور آزاد کے خیال کی موافقت میں متن سے جستہ جستہ نمونے پیش کریں گے،

پھلوں اور پھولوں کا ذکر:-

".....میوہ ہا خربزہ خوب اصلانیست، چیزے درشت و بے مزہ می شود کہ مردم این جا می گفتند خربزہ است بندہ خود باور نہ کرد و از ہمہ میوہ ہا انجیر این جا بد نیست و انگوری فقری و دیگر اقسام ہم می شود، اما فراوان انبہ و اناناس از اطراف بسیار دور می آرند، این جا خالی نیست، ابنرت پھل و کیلہ فراوان ست انبہ اینجا بد نیست، گل سرخ بغایت کم با وجود کی و کھوئی ہم چنبہ و دیگر گل ہائے ہندوستان بسیار است، درخت صندل در باغہا نشان می دہند، درخت فلفل بسیار است"،

صنعت و حرفت:-

"......و از محترفہ زرگران خوب و پارچہ بافان بے بدل اند و از ہمہ چیست دکن باز ہم است، کہ می توان گفت، و کاغذ پارچہ خوب در دو جا می سازند و می بافند کی از در ٹین دو دیگرے در دولت آباد"،

قتل عام:-

"......پیش ازین بچند سال این جا دو بار قتل عام شد، و یک کس از مردم ولایت زندہ نماند و تا سہ روز می کشتند مردم خوب از فضلاء و تجار و غیران کہ دریں مدت جمع شدہ بودند، بہ قتل رسیدند و خانہ ہا این ہا را بغارت بردند و یک بار دیگر بعد از آمدن برہان نظام الملک تاراج ازین بر سر غریبان شد و ہر کہ بر سر اسباب خود می ایستادمی کشتند، و زخمی می کردند برادران شیخ منور این جا غارت زدہ و زخمی ہستند و از شرم بہ خانہ خود نمی توانند رفت"،

امیدوار عنایت، اس سلسلہ میں شیخ منور کی حالت کی طرف شہنشاہ کو توجہ دلائی جاتی ہے، کہ چونکہ وہ تباہ و برباد ہو گئے ہیں، اسلئے شہنشاہ کی عنایت اور مہربانیوں کے منتظر ہیں،

"شیخ منور این جا امیدوار عنایت است"،

ابراہیم عادل کی عمر کا اندازہ ابراہیم عادل شاہ حاکم بیجاپور اس وقت بائیس سال کا تھا، جس کا ذکر فیضی نے اس طرح کیا ہی:-

"ابراہیم عادل خان حاکم بیجاپور بست و دو سالہ است برادر زادہ علی عادل خان خالی از جوہر سعادت نیست ارادت غائبانہ بہ حضرت دارد"،

میر تقی الدین محمد، میر تقی الدین محمد نامی ایک بزرگ کا ذکر فیضی کی زبان سے سنئے جس کے متعلق مشہور ہے، کہ وہ مذہب اور خصوصاً اسلام کا بڑا دشمن ہی،

"سر آمد دانشمندان عراق و فارس، میر تقی الدین محمد است کہ مشہور بہ تقیائی نسابہ است در دانشمندی او امروز در ولایت کسے نیست، امید است کہ بدرگاہ معلیٰ رسیدہ از مجلس عالی کہ محفل تدریس علوم کونی والٰہی و مقام اکتساب کمالات انفسے و آفاقیت مستفیض گردد"،

چلپی بیگ، چلپی بیگ نامی ایک عالم کی سفارش ان الفاظ میں کی گئی ہی،

"چلپی بیگ است در شیراز و قزوین تحصیل کرد، و درین دوازدہ سال او را ترقیات عظیم روی نمود، و از وہمہ جا میگویند، و حالا در شیراز است اگر ذرہ توجہ عالی بجناب او ہم شود بجای خود است"،

شعراء احمد نگر، احمد نگر کے مشہور شعراء، ملک قمی اور ملا ظہوری کے متعلق ہمعصرانہ چشمک کے بغیر فیضی نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ایک سند ہے،

"در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد، صافی مشرب اند در شعر رتبہ عالی دارند یکے ملک قمی کہ بسی کم اختلاط می کند و ہمیشہ ثمرہ تری دارد...... دیگر ملا ظہوری کہ بغایت رنگین کلام است و در مکارم اخلاق تمام عزیمت آستان بوس دارد"،

دربار کی جھلک، شہنشاہ کا سفیر کس طرح دربار منعقد کرتا تھا، اور شاہی فرامین راجاؤں اور بادشاہوں کو کسطرح پہنچاتا تھا آداب شہنشاہی اور رسوم دربار کسطرح بجا لاتا تھا، اگر انکی ایک جھلک دیکھنی ہو تو ذیل کے اقتباس میں دیکھیے، کیسا رنگین مرقع ہی، سفیر بالکل ہی شہنشاہی تزک و احتشام سے دربار منعقد کرتا ہی،

"...خیمہ و سراپردہ بود و سراپردہ ہا بآئینے کہ شائستہ بندہای درگاہ عالم پناہ باشد، ترتیب دادہ بود، و سراپردہ ہا را دو مرتبہ ساختہ بود، و در مرتبہ دوم تختے عالی تعبیہ کردہ بود، و بزربفت گرفتہ، و بر فراز تخت شامیانہای مخمل و زربفت کشیدہ و بر تخت شمشیر بادشاہی و خلعت خاصہ و فرمان عالی گذاشتہ بود و بعضے مردم آراستہ گرد و گرد تخت دست بستہ ایستادہ بودند و اسپان انعام ہم بآئین لائق در نظر بودند، راجعلی خان با مردم و وکلای حکام دکن باداب و قواعد کہ لایق بندگی و دولت خواہی باشد آمدہ از دور پیادہ شد و در سراپردہ کہ در مرتبہ اول بود، بادب تمام در آمد، با جمعیت خود، پیشتر روان شد، چون بسراپردہ دوم در آمد تخت عالی از دور نمودار شد تسلیم کرد و برہنہ پائی روان شد"،

شہور سنہ (شہور سن)

از

مولوی عبداللہ صاحب چغتائی مقیم پیرس

حال ہی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے ایک مفید یادداشت نمبر ۴۹ متعلقہ کتبات بیجاپور شائع ہوئی ہے، جسے میرے فاضل دوست ڈاکٹر محمد ناظم مؤلف کتاب "محمود غزنوی" نے ترتیب دیا ہے، اس میں انھوں نے ایک ضمیمہ بعنوان مندرجہ بالا قائم کرکے ثابت کیا ہے کہ دکنی مسلمانوں میں اس نام کا ایک الگ سن (تاریخ) ہجری کے علاوہ تھا، ان کے بیان کے مختصر الفاظ یہ ہیں:-

بیجاپور کے بعض کتبات میں یہ سنہ ملتا ہے، اور ابتدائی کاغذات مرہٹی میں سورسن پایا جاتا ہے، مہاراشٹر میں محمد بن تغلق کے زمانہ سے مرہٹہ عروج کے زمانہ تک یہ سنہ ہجری سنہ کے ہمراہ یا منفرد مقامی مال کے کاغذات پر دیا جاتا تھا، گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ مرہٹہ میں لکھا ہے، کہ یہ سورسن میرگ یا زراعتی سال کہا جاتا تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ جون کے مہینہ سے جبکہ کھیتوں کو بویا جاتا ہے، شروع ہوتا تھا، اسکی ابتدا سنہ ۷۴۴ھ (مرجون سنہ ۱۳۴۳ء) سے ہوئی، مگر اسی سال سے آیندہ یہ شمسی سال قرار پاگیا، یا سنہ ۷۴۴ ہجری ۴؍ مئی سنہ ۱۳۴۳ء کو ہوئی، دکن میں بقول ضیاء الدین برنی سلطان محمد بن تغلق کے خلاف ملک اسمٰعیل مبخ افغان کے تحت امرائے دکن نے سنہ ۷۴۵ھ میں بغاوت کی جس نے بعد میں سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کرلیا، اور یہ اغلب ہے کہ دکن میں اس نئی سلطنت کا قیام نئے سنہ کے افتتاح کا سبب بن گیا ہو،

تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی میں ہے:-

"در اواخر سال شہور سنہ خمس و تسعین و ستمائہ سلطان علاؤالدین درون شہر آمد...... در دہم ماہ شوال شہور سنہ اربع و خمسین و سبع مائیہ باعساکر قاہرہ از دہلی بیرون آمد و بر سمت لکھنوتی نہضت فرمود"

حاشیہ از ڈاکٹر ناظم۔ اگرچہ اس سنہ کی حقیقت کے متعلق کوئی علم نہیں، مگر یہ یقینی امر ہے کہ یہ دکن کے بعض علاقوں میں مرہٹی عروج کے زمانہ سے قبل استعمال میں تھا، لیکن اس مجموعہ (یادداشت نمبر ۴۹) میں کوئی کتبہ اس سنہ کی موجودگی کا کوئی فیصلہ کن ثبوت نہیں بہم پہونچایا،

میں ڈاکٹر ناظم صاحب کی اس تحریر کو خاصکر اسلامی سکوک اور کتبات پر کام کرنے والوں کے لئے بہت اہم خیال کرتا ہوں، اور میں خود بھی ایک ایسے ہی کام میں مشغول ہوں جس نے مجھے مجبور کیا، کہ میں جلد اس طرف توجہ کروں، اور دوسرے کام کرنے والوں کو بھی متوجہ کراوں، خود ڈاکٹر ناظم صاحب نے ایک اعلیٰ محقق کی حیثیت سے اس کی دعوت دی ہے، چنانچہ اس باب میں انھوں نے نہ کوئی ابتدائی تاریخ خاص دکنی مسلمانوں کی پیش کی ہے، اور نہ کوئی مرہٹی دستاویز، محض گرانٹ ڈف کا حوالہ دیدیا ہے، جو کافی نہیں، بہرحال اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں

"اس وقت مرہٹواڑہ میں عیسوی کے علاوہ چار تاریخیں استعمال کی جاتی ہیں، (۱) شالیوہن، (۲) سورسن یا عربی سال، (۳) فصلی، (۴) راج ابھشیک یا تاریخ جلوس سیواجی، (Mirag.) میرگ یا زرعی سال ہمیشہ ہمارے جون کے مہینہ سے شروع ہوتا ہے، جو ہندی مہینہ جیٹھ کے اخیر یا شروع چیت کے مقابل آتا ہے، اگرچہ ہندی سال قمری ہے، جسے شمسی کے ساتھ تطبیق دیدیا ہے، حساب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورسن (عام طور پر مسلمان شہور سن لکھتے ہیں،) میرگ بر سنہ ۷۴۵ھ میں جاری کیا گیا تھا، جو سنہ ۱۳۴۴-۴۵ء کے مطابق آتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ابتدا یقینی محمد بن تغلق نے کی ہے، اکبر کے زمانہ میں نربدا کے شمال میں فصلی سنہ شروع کیا گیا تھا، اور اسکے پوتے شاہجہان نے اسکو سنہ ۱۰۴۷ھ میں دکن میں رائج کیا، سورسن اور فصلی سنہ محض شمسی سنہ ہیں، ہجری سنہ سے ان کو تطبیق دیدیا جاتا تھا"

ان دونوں تحریروں سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، کہ اگر ڈاکٹر ناظم صاحب یہ عنوان اختیار کرتے، شمسی سن یا شہور سن، تو معاملہ بہت آسان تھا، آج بھی حیدرآباد دکن میں سرکاری تاریخ فصلی ہی شمار ہوتی ہے، جسکی جانب ڈاکٹر ناظم صاحب نے توجہ نہیں کی،

ناظم صاحب کے شائع کردہ مجموعہ میں صرف ایک کتبہ ایسا ہے، جس سے اس سن کی طرف توجہ منعطف ہو سکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس میں صاف لفظ ہجری موجود ہے، ملاحظہ ہو:-

این مسجد در دورِ سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ بہمنی بنا کردہ خواجہ سنبل نائب غیبت عادل خانی شہور سن ثمان عشر و تسعمایتہ ہجریہ" (پلیٹ اوّل ص۲۵)

مگر ایک امر ضرور ہے کہ برنی کی مندرجہ بالا عبارتیں اگر صحیح ہیں، اور ایک کتبہ جسے یزدانی صاحب نے شائع کیا ہے، ضرور اس طرف توجہ دلاتے ہیں، وہ کتبہ یہ ہے،

"المتغفور سلطان قلی ابن مرزا علی خاور اوّل شہور شوال ۹۷۲ھ روز چہار شنبہ بوقت ظہر شہور سنہ خمس و ستین و تسعمائۃ وفات یافت" (مسلم ایپی گرافیا اندو مسلیکا ۱۹۳۱-۲ء)

غرض یہ سن ضرور ہجری سے الگ معلوم ہوتا ہے، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ اس کی ابتدا کیا بنا کیا؟ اور یہ سنہ یقینی شمسی ہے، اور بالکل الگ معلوم ہوتا ہے، اس کے ثبوت میں میں ایک کتبہ اپنی یادداشت سے پیش کرتا ہوں، جو رانی سبرائی (غلط العام سیپری) احمد آباد کی مشہور مسجد میں ہے، نزدیک دروازہ استوریا،

قال اللہ تبارک — ابو النصر مظفر شاہ بن — خلد اللہ ملکہ بانیۃ المسجد المذکور

والدۃ ابی بکر خان بن سلطان محمود شاہ المسماۃ رانی سبرائی شہور اربع سنہ شمسیہ سنہ العشرین وتسعمائۃ

جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اس میں سبرائی مشہور سنہ اور شمسیہ کے الفاظ صاف ہیں، یہ عنقریب لاہور کے ادارہ معارف اسلامیہ کے روئداد کے ہمراہ شائع ہوگا، اس میں اس کا صحیح متن ملے گا، اسوقت اصل سامنے نہیں ہے، غرض جہاں بھی اس سنہ کو ہجری کے علاوہ استعمال کیا گیا ہے، وہاں کسی نہ کسی صورت میں

اسکی تصریح موجود ہے، اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ ہم کو جہاں شہور سنہ ملے اسکو شمسی سن تصور کر لینا چاہئے، اگر ایسا ہے تو میرے خیال میں ہمیں از سر نو بہت کچھ لکھنا ہوگا، اور نہ صرف کافی زحمت کا سامنا ہوگا، بلکہ بہت کچھ ردّ و بدل کرنا پڑے گا، اس لئے میں اس امر پر زور دیتے ہوئے کہ جہاں یہ سنہ یا ان کی تاریخ سنہ کے علاوہ ہے، وہاں کسی نہ کسی صورت میں تصریح ضرور موجود ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا شہادتوں سے عیاں ہے، ورنہ عام طور پر اس سنہ کو ہجری تصور کرنا چاہئے، اور ہمیشہ یہی شمار ہوا ہے، اور آخر تک ہوتا رہا ہے، اس کے ثبوت میں میں ابتدا سے کتبات سکوں اور تاریخی عبادتوں سے شواہد پیش کرتا ہوں،

ہندوستان میں اسوقت سب سے قدیم اسلامی عمارت مسجد قوت الاسلام دہلی شمار ہوتی ہے، اس کا ایک کتبہ ملاحظہ ہو،

"این حصار را فتح کرد و این مسجد جامع را بساخت بتاریخ فی شہور سنہ سبع و ثمانین و خمسمایتہ....."

اس مسجد اور قطب منار پر جسقدر کتبات ہیں، ان سب میں "فی شہور سنہ" ملتا ہے، اور ان ترک بادشاہوں کے جسقدر سکے ملتے ہیں، ان سب پر "فی شہور سنہ" ملتا ہے[1]، التمش کے متعلق طبقاتِ ناصری کی عبارت ملاحظہ ہو،

"در شہور سنہ ثلث و عشرین و ستمائتہ عزیمت فتح قلعہ رنتبور مصمم فرمود، و آن قلعہ در حصانت و متانت و استحکام در تمام ممالک ہند دستان مذکور مشہور است و در تواریخ اہل ہند چنین آوردہ اند کہ ہفتاد و اند بادشاہ بپاے آن قلعہ آمدہ بودند و ہیچ یکے را فتح آن حصار میسر نہ شد، بعد از مدت چند ماہ در شہور ثلث و عشرین و ستمایتہ بندگان او بفضل آفریدگار فتح شد"

اس عبارت میں دو جگہ شہور سنہ و در شہور آیا ہے، لیکن اس سے آجتک ہجری کے علاوہ کسی دوسرے سنہ کا گمان تک نہ ہوا، یہی شہور سنہ بطور ہجری ہم کو خاندان تغلق تک ملتا ہے جسکے عہد میں بقول ناظم صاحب

[1] ملاحظہ ہو: The Coinage of metrology of the Sultans of Delhi by H. N. Wright 1936

یہ شہور سنہ اور سن ہو گیا،

محمود بن تغلق کا ایک سکہ ملاحظہ ہو، جو اس نے خلیفہ مصر کے نام پر جاری کیا تھا[۱]:-

"ضرب ہذہ الدینار الخلیفۃ لدہلی فی شہور سنہ احدی واربعین وسبع مائۃ

فی زمان الامام المستکفی باللہ امیر المومنین ....."

چونکہ ناظم صاحب نے دکن کے متعلق زور دیا ہے، اس لئے ہمیں تاریخ فرشتہ کی طرف جو خاصکر دکن میں لکھی گئی رجوع کرنا چاہئے، مگر وہ بھی ہماری مدد نہیں کرتی، اس کے بعد ہم کو ہندوستان کی دوسری اسلامی سلطنتوں کے علاوہ جہاں ہم کو بہت سی ایسی شہادتیں ملیں گی، جن میں یہ شہور سنہ بطور ہجری استعمال ہوا ہے، آئین اکبری میں ابو الفضل نے ایک خاص باب تاریخ پر لکھا ہے، جس میں تمام سنین (تاریخیں) پر بحث کی گئی ہے، مگر بدقسمتی سے شہور سنہ ہم کو کہیں نہیں ملتا، البتہ ہم کو اس عہد کے کتبات ضرور ایسے ملتے ہیں، جن میں "شہور سنہ" کے الفاظ ہیں مثلاً لاہور میں مقبرہ صاحب الجمال (غلط العام مقبرہ انارکلی) کے تعویذ کا کتبہ ذیل،

"مجنون سلیم اکبر۔ آہ گر من باز بینم روے یار خویش را۔ تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را، شنہ ہزار و ہشت، اللہ اکبر، فی شہور سنہ ۱۰۲۴"[۲]

محمد صالح کنبو نے عمل صالح میں شروع میں ولادت شاہجہاں کے متعلق لکھا ہے:-

"..... یعنی ولادت باسعادت سلطان ..... ثانی صاحب قران ..... بجسب دستور العمل اہل تنجیم از شہور سنہ ہزار ہجری موافق بست و پنجم بماہ الٰہی سال سی و ششم اکبری در دار السلطنت لاہور وقوع یافت"

متذکرہ بالا شہادتوں کے علاوہ ہندستان کے متعلق قریب قریب ہر عہد میں ہم کو دوسری بیشمار ایسی شہادتیں ملسکتی ہیں، جن میں صاف ہجری سال مراد لیا گیا ہے، اس سے یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ناظم صاحب اس کو خاص دکن تک محدود کرتے ہیں، شہور سنہ ہجری سنہ کی صورت میں ہم کو نہ صرف ہندوستان، بلکہ ایران و توران تک ملتا ہے، ملاحظہ ہو ایک کتبہ جو نطنز میں ایک قدیم عمارت پر ہے:-

امر ببناء ہذہ المنارۃ العالیۃ والغرف الرافعۃ الملک الاعظم الصاحب المعظم اعدل ملوک العجم بانی قواعد الخیرات منبع السعادت باسط الامن والامان ناشر العدل والاحسان شمس الدولہ والدین ناصر الاسلام وعیون المسلمین محمد بن ابی علی تقبل اللہ حسناتہ فی شہور سنہ خمس و عشرین سبعمائۃ[۱]

ایک قدیم مخطوطہ کا اختتام ملاحظہ ہو:- (کلیات سعدی)

"—— ابو الفتح ابراہیم سلطان خلد اللہ ملکہ سلطانہ و اوضح علی العالمین برہ و احسانہ بارشاد جناب مخدوم استادم، یگانہ زماں و ہنرمند جہان خواجہ غیاث الدین محمد فرج اللہ مد ظلہ علی ید العبد مظفر بن عبد اللہ، اصلح اللہ —— در شہور سنہ تسع وعشرین وثمانمایہ والحمد للہ رب العالمین، ——"

نہایت اعلیٰ اور صحیح ایرانی تصویر کی تاریخ ملاحظہ ہو، جو یہاں پیرس کے میوزیم لودر میں (نمبر ۲۰) موجود ہے، اسے استاد محمدی نے بنایا ہے، اس پر اس کے دستخط اس طرح درج ہیں،

"بقلم فقیر الداعی محمد بن منصور فی شہور سنہ ۹۸۶"

غرض اس قسم کی بیشمار مثالیں جمع کیجا سکتی ہیں لیکن افسوس مجھکو فرصت نہیں ورنہ دوسرے اسلامی ممالک سے بھی اس کے شواہد تلاش کرتا، میرا مقصد یہ ہے کہ یہ شہور سنہ ہمیشہ ہجری سنہ رہا، جہاں کہیں اس سے شمسی یا کوئی اور سنہ مراد لیا گیا ہے، وہاں اسکی تصریح ضرور کسی نہ کسی صورت میں ملتی ہے، یا لفظ شمسی ملتا ہے، جیسا کہ

---

[۱] Thomas, p. 259 [۲] ملاحظہ ہو، اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۵ عیسوی، مضمون باغات زیب النساء بیگم،

[۱] آثار ایران ۱۹۳۶ء (آثار نطنز) از موسیو گودار، [۲] نسخہ پنجاب یونیورسٹی نمبر ۱۰۶۶

Natanz

میں نے اوپر احمد آباد کا کتبہ ثبوت میں پیش کیا ہے، میرا خیال ہے کہ ہم کو تاریخ کی کسی کتاب میں اسکی تصریح نہیں ملیگی، یہ سنہ محض کاشتکاروں کے لئے تھا جس سے سلطنت میں فصلی حساب رکھا جاتا تھا جو آج تک حیدرآباد دکن میں رائج ہے، میں اخیر میں دوسرے فضلا کی توجہ اس طرف مبذول کراتا ہوں کہ یہ نہایت اہم اور تحقیق طلب مسئلہ ہے،

ہم کو بے شمار کتبات ایسے ملتے ہیں جس میں صاف "فی التاریخ[1] سنہ الخ" و "فی سنہ الخ" در تاریخ سنہ " ملتا ہے ایسی حالت میں کیا ہمیں ان کو بھی کوئی الگ سنہ تصور کرنا چاہئے،

اس مختصر تحریر سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کو اہم سمجھ کر فضلا اپنی تحقیق سے اسکا فیصلہ فرمادیں۔

[1] اپی گرافیا انڈو مسلیکا، سنہ ۱۹۳۳-۳۶ء

الاصلاح

یہ رسالہ قرآنی مطالب و مباحث کے لئے مخصوص ہے، اس میں حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے قرآنی معارف بالالتزام شائع ہوتے ہیں، نیز مولانا کے ان تلامذہ کے تحقیقی مقالات بھی ماہ بماہ شائع ہوتے ہیں، جو مولینا کے اصول پر قرآن پر تدبر کر رہے ہیں، اس موضوع سے متعلق یہ ملک کا واحد رسالہ ہے، عام ذوق کی تسکین کے لئے سنجیدہ علمی و ادبی اور انگریزی کے موقر علمی رسالوں کے اہم اقتباسات بھی شائع کئے جاتے ہیں، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت دیدہ زیب ضخامت ۶۴ صفحے، سالانہ قیمت للعہ ششماہی ۱عہ،

"منیجر رسالہ الاصلاح"
(دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ)

تازہ فتوح

از

نواب صدر یار جنگ بہادر مولینا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

"شاہی نسخون" کے سلسلے میں ایک تازہ فتوح مضمون بالا لکھنے کے بعد حاصل ہوئی، قدردانان معارف کی ضیافت طبع کے لئے کیفیت عرض کرتا ہون،

یہ مطول علامہ تفتازانی کا نسخہ ہے، مکمل محشی اور خوشخط جلی لکھا ہوا، لوح کتاب پر جہانگیر بادشاہ کے ہاتھ کی یہ عبارت ہے، لوح کا اخیر حصہ کرم خوردہ ہے، جو الفاظ باقی ہیں، وہ کشادہ اور جو کل یا کسی قدر کرم خوردہ ہیں، وہ قیاساً قوسین کے اندر درج کئے جاتے ہین،

اللہ اکبر

۱- مطول در علم فصاحت (وبلاغت)
۲- بخط سید المحققین، (وسند)
۳- المدققین میر سید، (شریف)
۴- جرجانی ......[1] (بعد ملا)
۵- حظہ داخل کتاب خانہ (این نیاز)
۶- مندرگاہ الٰہی شدسنہ (۱۰ جلوس) (جلوس)

[1] (نمایاں شکل) کہ ا ۔ سراد،

۷۔ مطابق ۱۰۲۳ سنہ ہجری   ؁   (حررہٗ محمد)

۸۔ نورالدین جہانگیر ابن

۹۔ اکبر بادشاہ غازی،

شاہی عبارت کے علاوہ تیرہ مہریں اور متعدد "عرض دیدہ" لوح اور خاتمے کے ورق پر ہیں، مہروں میں سے چھ شاہی امرا کی ہیں، شاہجہانی، عالمگیری، اور دارا شکوہی، شاہجہانی امرا میں ممتاز خان، عثمان خان ہین، عالمگیری، عبداللہ خان،

اس موقع پر دربار جہانگیری نے ایک مغالطہ کھایا ہے، آخر کتاب کی عبارت ہی،

"تم الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب علی ید العبد الضعیف سید شریف یوم الجمعۃ الرابع من شہر رمضان سنۃ تسع وثلاثین وثمانمائۃ (محوطہ) سمرقند حماہا اللہ عن الآفات"،

مغالطہ یہ ہی کہ میر سید شریف جرجانی کی وفات بالاتفاق ۸۱۶ھ میں ہے،

(دیکھو شذرات الذہب، کشف الظنون، طبقات شاہجہانی،)

اسطرح یہ نسخہ انکی وفات کے تیئیس ۲۳ برس بعد لکھا گیا، کاتب کی ہمنامی نے اونکو میر سید شریف کا مرتبہ دیا، اور بادشاہ نے جرجانی کا اضافہ کرکے سند بخشدی، اگر علامہ جرجانی کی تاریخ وفات پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ مغالطہ نہ ہوتا،

میرے پاس بھی یہ نسخہ دو ندرتیں لیکر آیا تھا، جہانگیر بادشاہ کے ہاتھ کی عبارت میر سید شریف جرجانی رح کا نوشتہ تحقیق سے ایک ندرت قائم رہی، دوسری معدوم ٹھہری، خیر ایک ندرت بھی ہیون خریدن سے بڑھ کر ہے،

—————.—————

سید انشاء کا غیر مطبوعہ قطعہ اور اسکی شان نزول

از

جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ،

آزاد نے آب حیات میں سید انشاء کی چند رباعیاں درج کی ہین، اور ان کی وجہ تصنیف یہ بتائی ہے کہ سعادت علی خان کے اہل دفتر میں ایک مولوی صاحب تھے، جن کے قلم سے اجناس کی جگہ غلطی سے اجنا نکل گیا، سعادت علی خان نے گرفت کی تو انھوں نے قواعد زبان اور لغت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ اجنا غلط نہیں، سید انشاء نے ان کی ہجو میں رباعیان اور قطعے لکھے، مولوی صاحب کی شان میں انشا نے جو کچھ کہا ہی آزاد نے سب کا سب نقل نہیں کیا، مطبوعہ کلیات میں اس سے زائد ہی، کلیات کے کئی قلمی نسخے اسوقت تک ہماری نظر سے گذرے ہیں، ان میں بھی وہی نظمیں ہیں، جو مطبوعہ نسخون میں درج ہیں، لیکن تذکرۂ ناصر میں ایک قطعہ ایسا بھی ہی، جو کلیات کے کسی نسخہ مین نہیں پایا جاتا، ذیل میں ہم یہ قطعہ اور اس کے متعلق ناصر کا بیان تذکرے کے قلمی نسخے سے نقل کرتے ہیں، ناظرین سے گذارش ہے کہ وہ آزاد کے بیان کو بھی پیش نظر رکھین، تاکہ انھین یہ پتہ چل سکے کہ دونوں کے بیانات میں کیا فرق ہے،

"ایک دن کسی محرر نے عرضی میں اجناس کو سہو سے اجنا لکھا، اور سین کو فراموش کیا، نواب نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا لفظ ہے، اس نے عرض کی، مخفف اجناس اجنا ہی،

ہنوز اس سے استفسار فرماتے تھے، کہ میر انشاء اللہ خاں باریاب ہوئے، حضور نے اس قضیہ کا ان کو حکم کیا، وہ عزیز بہ خیال اس کے کہ اقرار سہو میں زیر باری جرمانے کی بہ حسب ضابطہ مقرر تھی، جو لفظ جس سے رہ جاتا، اس کے ہم عدد اس پر جرمانہ ہوتا، میر انشاء اللہ خاں سے بھی معقول نہ ہوا، میر موصوف نے برجستہ یہ قطعہ انشا کیا:-

یہاں ہے اک جنا ایسا کہ جس نے — لکھا ہے موقع اجناس اجنا

زہے وہ کاغذ ابری کہ جس پر — لغت کے بادلوں کا ہو گرجنا

وہ اپنے معترض کو یوں کہے ہے — زبان پوربی میں مورے سجنا

کہ اجنا از زمیں چیزے کہ روید — وہ جہ کا بھوئیں سے ہووت ہے اپجنا

صراح اندر لکھت ہیں اسکی تصریح — رہا اب آگے باتی ڈھول بجنا

مرخم اور مخفف ہوت ہیں لفظ — بجا ہے جنّا کو کہنا جنا

ہوا یہ قاعدہ انشا، تو پھر تو،

کہا کر کاجنا دولہ کو کجنا (کذا)

رسائل عماد الملک

کی قیمت میں غیر معمولی تخفیف

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی مرحوم کی اعلیٰ شخصیت سے علمی دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے، آپ کے فضل و کمال کی شہرت نہ صرف ہندستان بلکہ یورپ تک ہے، یہ نادر مجموعہ (رسائل عماد الملک) آپکے بارہ بلند پایہ علمی مضامین اور پانچ خطبات پر مشتمل ہے، جس کی قیمت پہلے للعہ تھی لیکن اب عاہر کر دی گئی ہے، ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت :- عاہر

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستانی زبان کے متعلق چند غلط فہمیاں

"ہندوستانی ایکاڈمی الہ آباد کے لائق سکریٹری ڈاکٹر تاراچند نے اس عنوان سے انگریزی میں ایک تحقیقی مضمون لکھا ہے، اور وہ اخبار لیڈر (الہ آباد) میں چھپا ہے، اور الگ رسالہ میں بھی نکلا ہے، معارف کے ناظرین کی دلچسپی اور فائدہ کے لئے آیندہ صفحوں میں اس کا آزاد ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے؛"

"اڈیٹر"

اردو ہندی کا مسئلہ جس پر کچھ دنوں سے بحثیں ہو رہی ہیں، کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے، کہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں جب ڈاکٹر گلکرسٹ (J. B. Gilckrist.) نے للولال، سدل مسرا، میر امن، میر بہادر علی، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، مظہر علی خان ولا، نہال چند، شیر علی افسوس وغیرہ کو فورٹ ولیم کالج میں فارسی اور برج بھاشا کتابوں کے ترجمہ کی خدمت پر مقرر کیا، تو ترجمہ کی زبان کے نام رسم الخط، معیار اور طرز کا سوال پیدا ہو گیا تھا، انیسویں صدی میں شروع سے آخر تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا، اور کبھی کبھی تو اس پر شدید مباحثے بھی ہوئے، چنانچہ اس صدی کے ثلث آخر میں جان بیمز (John Beames) اور گروز (Growse.) نے علمی رسالوں میں اس پر باقاعدہ مباحثے جاری کئے، راجہ

شیو پرشاد ستارہ ہند نے بیز کی حمایت کی جس کا خیال تھا، کہ زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کو کم کرنا چاہئے، راجہ لکشمن سنگھ نے اس کی مخالفت کی، وہ گروز کی رائے سے متفق تھے، کہ عربی فارسی الفاظ کے بجائے سنسکرت الفاظ کو داخل کرنا چاہئے، مسیحی مبلغین نے بھی اوسی جانب زور دیا، سرجی اے گریرسن (Sir G. A. Grierson) اپنی کتاب لنگوئسٹک سروے آف انڈیا (Linguistic Survey of India) جلد (۹) حصہ (۱) میں لکھتے ہیں:-

"بدقسمتی سے اس دور میں قوی ترین انگریزی اثر سنسکرت کے طرفداروں کا حامی رہا، مسیحی مبلغین نے اس سنسکرت نما ہندی کو کثرت سے استعمال کیا، اور اس میں بائبل کے ترجمے کئے گئے، ان چند مصنفین کو جو خالص ہندی کے استعمال کے حامی تھے، گمراہ کن کوشش کی اتنی زبردست مثال کے مقابلہ میں بہت کم کامیابی ہوئی"

بیسویں صدی کے آغاز سے اس مسئلہ پر پھر شدت سے بحث شروع ہوگئی ہے چونکہ اس کے حل پر اہم علمی نتائج کا انحصار ہے، اسلئے ضرورت ہے کہ بغیر کسی نامناسب جوش اور جہاں تک ممکن ہو بغیر جانبداری کے اس پر گفتگو کی جائے، نفس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے میرے نزدیک ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ جن ناموں کو ہم استعمال کرتے ہیں، ان کی تعریف واضح طور پر کردیجائے، کیونکہ میرے خیال میں بہت کچھ غلط فہمی اس چیز کے صاف نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے، اس سلسلہ میں بہت سے نام استعمال کئے گئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:-

"بھاشا، ہندوی، ہندی، ہندوستانی، دہلوی زبان، کھڑی بولی، مدھیہ دیش کی بولی، ریختہ، زبان اردوئے معلی، اردو"

ان ناموں میں سے ہندی، ہندوستانی اور اردو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ اہم ہیں

درحقیقت بحث اب زیادہ تر انہی کے استعمال میں محدود ہوگئی ہے،

ہندی

آئیے سب سے پہلے ہندی پر غور کریں، ہندی یا ہندوی کا نام مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے، ان میں سے تین اہم ترین معنی حسب ذیل ہیں:-

۱- ہندی یا ہندوی سے عموماً وہ چیزیں مراد لی گئی ہیں، جو ہندوستان کی ہیں، اس معنی میں ہندی یا ہندوی کا استعمال اسوقت سے چلا آتا ہے، جب سے کہ مسلمانوں کا تعلق ہندوستان کے ساتھ قائم ہوا، اور یہی نام اُس ہندی آریائی (انڈو ایرین) زبان کا پڑ گیا، جسے مسلمانوں نے لاہور اور دہلی کے شہروں اور مضافات میں سکونت اختیار کرنے کے بعد بولنا شروع کیا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں، ۱۲۸۸ء میں محمد عوفی نے ایک مجموعۂ کلام مرتب کیا، جس میں وہ خواجہ مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کا ذکر کرتا ہے، علاء الدین خلجی کے عہد (۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۵ء) میں فخرالدین مبارک غزنوی نے ایک لغت مرتب کیا جس میں فارسی الفاظ کے ہندی معنی لکھے ہیں، امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء) ہندوی اور ہندی کے نام استعمال کرتے ہیں، شاہ میران جی شمس العشاق اپنی تصنیف کی زبان کا نام ہندی بتاتے ہیں، دکن میں ہندی کا نام دکنی کے نام کے ساتھ عموماً استعمال ہوتا تھا، نصرتی جو علی عادل شاہ ثانی، فرمانروائے بیجاپور (۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۲ء) کے دربار کا شاعر تھا، اپنے ہندی اشعار کا ذکر کرتا ہے جس شاعری کی نشو و نما دکن میں ہوئی تھی، اسکی سرپرستی جب دربار مغلیہ نے اختیار کی تو شعرائے دہلی نے بھی اپنے کلام کی زبان کو ہندی ہی کے نام سے منسوب کیا، اس کی بہیتری مثالیں شعراء میں شاہ حاتم سے لے کر غالب تک اور نثر نگاروں میں ابتدائی دور سے لے کر سرسید احمد خان تک ملتی ہیں، لہذا اس معنی میں ہندی اور وہ زبان جو بعد میں اردو کے نام سے مشہور ہوگئی، ایک ہی زبان کے نام ہیں،

۲- لفظ ہندی ایک دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، اس معنی میں اس سے وہ زبان

مراد لی جاتی ہیں، جن کو گریرسن، ٹرٹیاری پراکرت (Tertiary Prakrits) یا ڈاکٹر اس کے چٹرجی "جدید ہندی آریائی زبانیں" کہتے ہیں، یہ زبانیں مغرب میں سرہند سے لیکر مشرق میں بنارس تک اور شمال میں ہمالیہ کی ترائی سے لیکر جنوب میں دریائے نربدا تک رائج رہی ہیں، ان میں زبانون کے وہ دو خاندان شامل ہیں، جو مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کے نام سے... اس طرح ہندی میں مندرجۂ ذیل زبانیں شامل ہیں:- (۱) بندیلی (۲) قنوجی، (۳) برج بھاشا (۴) بنگرو (۵) ہندوستانی یا کھڑی بولی (۶) اودھی (۷) بگھیلی اور (۸) چھتیس گڑھی، بعض لوگ ان آٹھ زبانون میں راجستھانی، اور گڑھی کا بھی اضافہ کرتے ہیں، اس معنی میں ہندی میں وہ تمام بولیاں داخل ہیں، جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہیں،

(۳) ہندی سے خصوصیت کے ساتھ وہ جدید زبان بھی مراد لی جاتی ہے، جو ہندوستانی کھڑی بولی یا دہلوی کی ادبی شکل ہے، آواز اور ساخت کے لحاظ سے جدید ہندی اُن زبانون سے مختلف ہے، جو مشرقی ہندی اور مغربی ہندی زبانوں میں شامل ہین، اس لحاظ سے جدید ہندی اور ہندی (اپنے پہلے معنی میں) یعنی اردو ایک ہی چیز ہیں،

اردو لفظ اردو کو ہندی کے معنی میں غالباً سب سے پہلے مصحفی نے استعمال کیا، میر اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں زبان اردوے معلی کا نام استعمال کرتے ہیں، یہ نام قائم کے مخزن نکات (۱۷۵۴ء) میں بھی ملتا ہے، دکن کا ایک شاعر باقر آگاہ لفظ اُردو ۱۷۷۲ء میں استعمال کرتا ہے، اور علی ابراہیم خانصاحب تذکرہ گلزار ابراہیم میں بھی ۱۷۸۴ء میں یہ لفظ استعمال کرتے ہین، عطا حسین تحسین مصنف نوطرز مرصع (۱۷۷۰ء یا ۱۷۹۸ء) زبان اردوے معلی کا ذکر کرتے ہین، میر امن اپنی باغ و بہار (۱۸۰۱ء) کی زبان کا نام اردو بتاتے ہین، انیسوین صدی میں اس نام نے شہرت حاصل کرلی، آج اس سے وہ زبان سمجھی جاتی ہے، جو ہندوستانی کھڑی بولی، یا دہلوی کی ادبی شکل ہے، اور

ساخت کے لحاظ سے یہ اور جدید ہندی ایک ہی چیز ہے، اس میں اور ہندی میں صرف اُن الفاظ کا فرق ہے، جو اس نے دوسری زبانون سے لئے ہین،

ہندوستانی زبان ہندوستانی کا نام وجہی (۱۶۳۵ء) کی تصنیفات، تاریخ فرشتہ (۱۵۹۰ء) اور عبد الحمید لاہوری (متوفی ۱۶۵۴ء) کے بادشاہ نامہ میں آتا ہے، زبان کے لئے یہ نام سولہوین اور سترہوین صدی میں کافی طور پر مشہور تھا، اور یورپین سیاحون نے بھی جو اُس زمانہ میں ہندوستان آئے تھے یہی نام اختیار کرلیا تھا، چنانچہ ٹیری (Terry.) (۱۶۱۶ء) اور فرائر (Fryer) ۱۶۷۳ء اس کو "اندوستان" (Indostan) کہتے تھے، امادوزی (Amaduzzi) ایک لُغت لنگوے اندوستانیکے" (Linguae Indostanicae) کے قلمی نسخہ کا ذکر کرتا ہے، (۱۷۰۴ء) اور کیٹے لیر (Ketelaer) نے ۱۷۱۵ء کے قریب لنگوا ہندوستانیکا" (Lingua Hindostnica) کی پہلی گرامر اور فرہنگ مرتب کی، لفظ ہندوستانی اٹھارہوین صدی میں رائج ہو گیا تھا، میر امن نے جب ۱۸۰۱ء میں باغ وبہار لکھی، تو انہون نے ٹھیٹھ ہندوستانی لکھنے کا خاص طور پر التزام کیا، ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنی کتابوں کے عنوان سے ہندوستانی کا نام استعمال کیا ہے، مثلاً "انگریزی ہندوستانی ڈکشنری" اور گارسن دی تاسی (Garcin de Tassy.) نے پیرس میں جو خطبات دیے تھے وہ ہندوی اور ہندوستانی پر تھے، ہندوستانی کا نام کھڑی بولی کے لئے استعمال کیا گیا ہے، بہتیرے اہل قلم نے اسے اردو کے اور بعضوں نے جدید ہندی کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا ہے، اگریرسن کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے:-

"ہندوستانی اصل میں گنگا کے بالائی دوآب کی زبان ہے، اور ہندوستان کی لنگوا فرنکا بھی ہے، جو فارسی اور دیوناگری دونوں حروف میں لکھی جا سکتی ہے، اور بغیر اس کے کہ

اس کی اصل پر حد سے زیادہ زور دیا جائے، فارسی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت سے پرہیز کرکے اسے لٹریچر میں استعمال کر سکتے ہیں، لہذا اردو ہندوستانی کی صرف وہ خاص قسم ہو سکتی ہے جس میں فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں، .... اور اسی طرح ہندی ہندوستانی کی صرف وہ شکل ہے جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہو"

بس ہندوستانی کوئی جدید نام نہیں ہے، جو ہندی اور اردو کی جگہ لینے کے لئے وضع کیا گیا ہے، بلکہ یہ اوس زبان کا ایک تسلیم شدہ اور قدیم نام ہے، جو اپنی دو مختلف شکلوں اردو اور ہندی کی مشترک بنیاد ہے،

ہندوستانی کی تاریخ نام سے متعلق غلط فہمی نے خود زبان کی نسبت عجیب و غریب غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں، یہ غلط فہمیاں یا تو لٹریچر کی مختلف شاخوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں، یا لفظ ہندی کے مذکورۂ بالا تین معنوں خصوصاً دوسرے اور تیسرے معنوں کو باہم خلط کردینے سے پیدا ہوئی ہیں، ہندی کی نشوونما پر گفتگو کرتے وقت بعض لوگ یہ واقعہ نظر انداز کر دیتے ہیں، کہ ہندی کی تاریخ راجستھانی، برج بھاشا اور اودھی قسم کی زبانوں کی تاریخ سے مختلف ہے اور وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ہندی اور اردو کی تاریخ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں،

ہندوستانی یا کھڑی بولی جو نئی ہندی آریائی زبانوں کی ایک شاخ کی ترقی یافتہ شکل ہے، اس وقت سے اپنی مسلسل تاریخ رکھتی ہے، جب دسویں صدی عیسوی کے قریب اس نے وسط ملک کی دوسری زبانوں سے علحدگی اختیار کرلی جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے، یہی وہ بنیادی زبان ہے، جسے دریائے گنگا کے بالائی دوآب اور اس کے ہمسایہ علاقوں کے باشندے برابر بولتے آئے ہیں، بول چال کی اسی زبان کو مسلمانوں نے اختیار کرلیا، جب بارھویں صدی کے آخر میں، وہ شہر دہلی اور اس کے مضافات میں آکر آباد ہوئے، نو واردوں کے بہت

سے الفاظ کھڑی بولی میں داخل ہوگئے، اور اس کی ساخت میں بھی کچھ خفیف سی تبدیلیاں واقع ہوئیں، اب یہ ترمیم شدہ زبان ادب کی زبان بن گئی، کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی میں امیر خسرو نے یہی زبان استعمال کی، لیکن چونکہ ان کے وقت کی کوئی تحریری شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے، اس لئے یہ بیان شبہہ سے خالی نہیں، بہرحال دکن میں یہ زبان نظم و نثر دونوں میں استعمال کی جانے لگی، اور چودھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک وہاں ایک وافر لٹریچر اس زبان میں جمع ہو گیا، اس لٹریچر کی زبان دیسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے، اور یہ لٹریچر تمام تر غیر ملکی عناصر سے گرانبار بھی نہیں ہے، مصنفین دکن بہت بجا طور پر اپنے کو ہندی کا مصنف خیال کرتے تھے، اور یہی نام وہ اپنی نظم و نثر کی زبان کے لئے استعمال کرتے تھے،

اگرچہ کھڑی بولی یا ہندوستانی شمالی ہند کی بولی تھی تاہم ادبی حیثیت سے اس کی ترقی زیادہ تر دکن میں ہوئی، شمالی ہند کی مشکل کوئی تصنیف اس زبان میں ایسی ہے، جو سترہویں صدی سے پہلے کی قرار دی جا سکتی ہو، بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ جب کھڑی بولی ایک مہذب اور ادبی زبان کی حیثیت سے تیرھویں صدی میں نمودار ہوئی، تو اسے راجستھانی کا مقابلہ کرنا پڑا، جو اس زمانہ میں شمالی ہند کی مقبول عام ادبی زبان تھی، اسی زبان میں جینی تصنیفات لکھی جاتی تھیں، اور نرپتی نلہ اور دوسرے شعرا اپنے کلام لکھتے تھے،

پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کی ترقی سے تین فرقے پیدا ہوگئے، ۱- نراکر بھگتی، ۲- کرشن بھگتی، اور رام بھگتی، پہلے فرقہ کے بزرگوں نے مثلاً کبیر، نانک اور دادو نے اپنے مسلک کو عوام میں پھیلانے کے لئے دوسری بولیوں کے ساتھ کھڑی بولی یا ہندوستانی کو بھی استعمال کیا، دوسرے فرقہ کے مبلغوں سورداس اور نندداس وغیرہ نے اپنے بھجن اور گیت صرف برج بھاشا میں سنائے، تیسرے فرقہ کے پیشوا جن کے سردار گوسوامی تلسی داس تھے اپنی

تصنیفات میں اودھی زبان استعمال کرتے تھے،

اس طرح پندرہوین اور اس کے بعد کی صدیوں میں لٹریچر زیادہ تر برج بھاشا اور اودھی میں ترقی کرتا رہا، ان زبانون کو نہ صرف ہندو اہل قلم نے استعمال کیا، بلکہ مسلمان شعرا نے بھی انھیں اپنا بنالیا، رحیم، رس خان، اور رسلین برج بھاشا شاعری کی تاریخ میں ویسے ہی مشہور ہیں، جیسے ہندو شعراء، اور یہ بات ہر شخص کو تسلیم ہی کہ اگر ملک محمد جائسی کی بنیادی تصنیف نہ ہوتی، تو رام چرت مانس کی شاندار عمارت اودھی میں قائم نہ ہوسکتی،

کھڑی بولی، اس عہد میں جدید ہندی یا سنسکرت نما ہندوستانی ابھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی، بول چال کی زبان کھڑی بولی تھی، لیکن ادبی تصنیفات لیے ہندی (مفرس ہندوستانی) برج بھاشا اور اودھی رائج تھیں، اور انہی زبانون کا سکہ اٹھارہوین صدی کے آخر تک چلتا رہا، حال کے بعض مصنفین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہی کہ اٹھارہویں صدی سے بیشتر بھی جدید ہندی کا ایک لٹریچر تھا، لیکن یہ کوششیں مشکل سے کامیاب کہی جاسکتی ہیں، سولہ صفحوں کا ایک رسالہ بہ عنوان "چند چھند برنن کی مہما" جسے گنگا بھٹ نے سولہوین صدی میں لکھا تھا، جدید ہندی نثر کا پہلا نمونہ فرض کیا جاتا ہے، اور پھر ایک طویل وقفہ کے بعد سترہویں صدی میں جٹمل کی "گورا بادل کی بات" ملتی ہے، لیکن ان میں سے پہلی کتاب کی زبان برج بھاشا اور کھڑی بولی کی مخلوط زبان ہے، اور دوسری کے متعلق یہ ثابت ہوگیا ہے کہ وہ انیسوین صدی میں لکھی گئی تھی، اور دراصل راجستھانی زبان کی ایک نظم کی کتاب کا نثر میں ترجمہ ہے، کہا جاتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کی دو تین کتابین اور ہین، جن میں کھڑی بولی استعمال کیگئی ہے، مثلاً مانڈوار کا ورنن، چکتا کی پٹیا ہی پرمپرا، لیکن اس زمانہ کی ہندی (مفرس ہندوستانی) برج بھاشا اور اودھی کی نثر کی کتابون کے مقابلہ میں ان کتابوں کی ادبی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے،

ان تمام صدیوں میں ہندی (مفرس ہندوستانی) نہ کہ جدید ہندی (سنسکرت نما ہندی) ہندوستان کی مشترک زبان (لنگوا فرینکا) اور ہندو اور مسلمان دونوں کی مہذب سوسائٹی کی زبان تھی، چنانچہ ۱۸۷۱ء میں بھارتندو ہرش چندر نے فرقہ اگروال کی اصل پر جو کتاب لکھی تھی، اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:- "ان کی بولی استری اور پرش سب کی، کھڑی بولی ارتھات اردو ہے" جو زبان فرقہ اگروال کی تھی، وہی شمالی ہند کے دوسرے فرقوں کی بھی تھی،

جدید ہندی (سنسکرت نما ہندی) کا آغاز تو انیسویں صدی کی ابتدا سے ہوا ہے، منشی سدا سکھ لال ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے علٰحدہ ہونے کے بعد الہ آباد میں مقیم ہوئے، اور انھوں نے سری مد بھگوت کا آزاد ترجمہ کرکے اس کا نام "سکھ ساگر" رکھا، تقریباً اسی زمانہ میں انشاء اللہ خاں نے "رانی کیتکی کی کہانی" لکھی، اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ اور فورٹ ولیم کالج کے انگریز پروفیسروں نے سدل مسرا اور للولال کو ہدایت کی کہ ہندوؤں کے لئے ایک ادبی زبان پیدا کریں، جو ہندی (مفرس ہندوستانی) کی قائم مقام ہو، مسٹر ایف اِی کے (F. E. Keay.) اپنی کتاب تاریخ ادب ہندی میں لکھتے ہیں:-

"اردو کے بہت سے الفاظ فارسی اور عربی زبانوں سے لئے گئے تھے، جو اسلام سے خاص طور پر تعلق رکھتی تھیں، ہندی بولنے والوں کے لئے ایک ایسی ادبی زبان کی بہت ضرورت تھی، جو ہندوؤں کے لئے زیادہ پسندیدہ ہو، اور یہ چیز یوں حاصل کی گئی، کہ اردو کوئے کروہ الفاظ اس میں سے نکال دئیے گئے جو فارسی یا عربی اصل کے تھے، اور انکی جگہ سنسکرت یا ہندی اصل کے الفاظ داخل کر دئیے گئے"، پھر لکھتے ہیں:- للولال کی ہندی حقیقۃً ایک نئی ادبی زبان تھی"

پنڈت چندر دھر شرما گولیری نے ۱۹۲۱ء میں ناگری پرچارنی پتریکا میں قدیم ہندی پر مضامین کا ایک سلسلہ لکھا تھا، وہ لکھتے ہیں:- "میرے کہنے کا تاتپریہ (مطلب) یہ تھا کہ ہندوؤں

کی رچی ہوئی پرانی کویتا (شاعری) جو ملتی ہے، وہ برج بھاشا یا پوربی بیشواری، اودھی، راجھتانی،
گجراتی آدی (وغیرہ) ہی میں ملتی ہے، ارتھات (یعنی) "پڑی بولی" میں پائی جاتی ہے، کھڑی بولی
یا پکی بولی یا ریختہ یا ورتمان ہندی (موجودہ ہندی) کا ارمبھ کال (شروع زمانہ) کے گدیہ (نثر)
اور پدیہ (نظم) کو دیکھ کر یہی جان پڑتا ہے کہ اردو رچنا (مضمون) میں فارسی عربی تتسم (مصدر اصلی)
یا تدبھوون (مصدر فرعی) کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تتسم اور تدبھو رکھنے سے ہندی بنالی گئی ہے،
موسیو بلوک (M. gules Bloch.) مصنف "تشکیل زبان مرہٹی"
(La For mation de la Langue Marathe) کے، اور گولیری
کے بیانات کی تصدیق کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔ "للولال نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے زیر ہدایت
اپنی مشہور کتاب پریم ساگر لکھ کر وہ سب کچھ بدل دیا، اس کتاب کے نثر کے حصے بحیثیت مجموعی
اردو ہیں، جس سے فارسی الفاظ تمام تر نکال دیئے گئے ہیں، اور ان کی جگہ ہندی آریائی (Indo
Aryan) الفاظ رکھدئے گئے ہیں۔ .... یہ نئی زبان ہندوؤں کے لئے ایک
لنگوا فرینکا ہوگئی"

(باقی)

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب ولہجہ دل آزاری اور تعصب سے
خالی نہیں ہوتا، اور اسوجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہوجاتا
ہے، مولینا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ
اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے
بنانے میں جو کام کئے ہیں وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب وملت معلوم ہوجائیں،

ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت :۔ عمر "منیجر"

اخبار علمیہ

جسمانی امراض کا دماغی علاج

جسم پر دماغ کو جو حکمرانی حاصل ہے، اس کے حیرت انگیز تجربے اکثر ہوتے رہتے ہیں،
چند مہینے ہوئے کیلی فورنیا (امریکہ) کے قید خانہ میں ایک عورت نے جو قتل کے جرم میں ماخوذ تھی،
محض قوت ارادی کے ذریعہ سے اپنے کو ہلاک کر دینا چاہا اور اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب
بھی ہوگئی یعنی رفتہ رفتہ اسپے بیہوشی طاری ہوتی گئی، اس کے ہاتھ پیر مفلوج معلوم ہونے لگے، اور کامل
ایکسودس گھنٹے تک وہ سکتے کے عالم میں بے حس وحرکت پڑی رہی، پھر بمشکل ہوش میں لائی جاسکی،
ہر طبیب کو اس کا تجربہ ہے کہ بیماری اور صحت میں نفسیات کو کسقدر دخل ہے، اسی طرح ہر شخص
جانتا ہے کہ مختلف جذبات کا اثر جسم پر کیا پڑتا ہے، مثلاً شرم سے ہم منفعل ہوجاتے ہیں، خوف سے
زرد پڑجاتے ہیں، اور پریشانی کی حالت میں ہمارا منہ بالکل سوکھ جاتا ہے، لیکن بعض لوگوں پر جذبات
کا اثر غیر معمولی طور پر شدید پڑتا ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات دماغی صدمہ کی وجہ سے
ہاتھ پیر شل ہوگئے ہیں، آنکھوں کی روشنی دفعۃً زائل ہوگئی ہے، اور عجیب وغریب جلدی بیماریاں
اور مختلف جسمانی امراض پیدا ہوگئے ہیں، ایک اتفاقی حادثہ میں ایک شخص کی بیوی ہلاک ہوگئی،
اس کا اثر اس کے دماغ پر اسقدر سخت پڑا کہ دفعۃً اسکی بینائی جاتی رہی، لیکن روشنی مستقل طور پر
زائل نہیں ہوئی تھی، ڈیڑھ سال کے بعد جب اوس نے دوسری شادی کی تو روشنی آنکھوں میں پھر

آگئی، دماغی امراض کے طبیبوں کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے، جن کے کان سالم اور درست ہوتے ہیں، لیکن وہ سن نہیں سکتے، اور جن کی ٹانگیں توانا اور مضبوط ہوتی ہیں، لیکن وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتے ہیں، تھوڑے دن ہوئے، امریکہ کے ایک ہسپتال میں ایک شخص آپریشن کے لئے لایا گیا، جو اس بری طرح سے لُنج تھا، کہ اپنے ہاتھ کو ذرا بھی موڑ نہیں سکتا تھا، آپریشن کی میز پر لٹا کر جب اُسے بیہوش کیا گیا، تو ڈاکٹروں کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، کہ اس کے ہاتھ کے جوڑ بالکل نرم اور ڈھیلے ہیں، [illegible] یہ تھا، کہ ہاتھ میں کوئی خرابی نہ تھی، بلکہ کسی دماغی صدمہ سے مریض یہ تکلیف محسوس کرنے لگا تھا،

ایسے مریضوں کا علاج اگر نفسیاتی طور پر کیا جائے تو زیادہ کامیاب ہوتا ہے، کبھی کبھی ایک معمولی سا حیلہ مریض کو تندرست کر دیتا ہے، مثلاً ایک عورت کو وہم ہو گیا تھا، کہ اسکے حلق میں مچھلی کا کانٹا پھنس گیا ہے، حیرت یہ ہے کہ وہ اسکی شدید تکلیف بھی محسوس کر رہی تھی، اور اس تکلیف سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا، حلق کے ایک ماہر ڈاکٹر نے بہت غور سے دیکھا، مگر کوئی چیز نظر نہ آئی، حلق بالکل صاف تھا، مریضہ نے ڈاکٹر کو فوراً واپس کر دیا، اس کے بعد ایک دوسرا ڈاکٹر بلایا گیا، وہ علاج کے نفسیاتی طریقہ سے بھی واقف تھا، اس ڈاکٹر نے بھی سمجھ لیا کہ جب تک مچھلی کا کانٹا عورت کے حلق سے برآمد نہ کیا جائے گا اوسکی حالت سنبھل نہیں سکتی، چنانچہ اس نے مچھلی کا ایک کانٹا چپکے سے اپنے ہاتھ میں چھپا کر اپنی انگلیاں مریضہ کے حلق کے اندر ڈالیں اور کچھ ٹٹول کر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ باہر کھینچ لیا، اور وہی کانٹا انگلیوں میں دبا کر اسے دکھا دیا، کانٹا دیکھ کر عورت چلا اُٹھی کہ میں پہلے ہی سے یہ جانتی تھی، اور اسکی ساری تکلیف فوراً ہی رفع ہو گئی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آتش زدگی یا دوسرے ناگہانی حادثوں کے موقع پر ایسے مریض جو اپنے کو مفلوج خیال کرتے تھے، اور چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے جان بچانے کے لئے دوڑنے لگے ہیں، چنانچہ ایک شخص کو جو اسی قسم کے فالج کا شکار تھا، اور چل پھر نہیں سکتا تھا، لوگ کرسی پر بٹھا کر بظاہر سیر کرانے کی غرض سے سمندر کے کنارے لے گئے

اور وہاں اسے چھوڑ کر خود ادھر اودھر گھومنے لگے، وہی وقت سمندر میں پانی کے بڑھنے کا تھا، تھوڑی دیر میں موجیں تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی اسکی کرسی تک پہونچ گئیں، یہ دیکھ کر وہ شخص جان بچانے کے لئے کرسی چھوڑ کر بھاگا، اور جب تک ایک بلند اور محفوظ مقام پر پہونچ نہیں گیا، اوسے احساس بھی نہ ہوا کہ میں دوڑ رہا تھا،

اس قسم کے واقعات میں مریض کو جو تکلیف ہوتی ہے، وہ محض وہمی نہیں ہوتی، تکلیف تو وہ حقیقۃً محسوس کرتا ہے، لیکن اس کا سبب حقیقی نہیں ہوتا،

تخلیقی تجربے

سوویٹ روس کے بعض سائنس دانوں نے روسی ترکستان کے جنگلوں میں ایک معمل قائم کیا ہے، اور وہاں اس بات کا تجربہ کر رہے ہیں کہ انسان اور شمپانزی بندر کے جوڑے سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں، لیکن اس تجویز کی اولیت کا سہرا ان کے سر نہیں ہے، ان سے پہلے ایک جرمن سائنسدان ڈاکٹر ہرمن کلاٹش (Hermann Klaatsch) نے تجویز پیش کی تھی، کہ افریقہ کے ملکی باشندوں اور گوریلا بندروں کے جوڑے سے اولاد حاصل کیجائے، اور اس مخلوق سے جو جسمانی حیثیت سے نہایت قوی لیکن دماغی حیثیت سے کمزور ہو گی، مزدوروں کا کام لیا جائے، سوویٹ سائنسدانوں کے تجربہ کا مقصد بالکل سائنٹفک ہے، وہ انسان اور بندر کے باہمی رشتہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور امید کرتے ہیں، کہ اس تجربہ میں بندر اور انسان کے درمیان منازلِ ارتقا کے تمام نمونے حاصل ہو جائیں گے، بعض اتفاقی حوادث کی وجہ سے روسی سائنسدانوں کے تجربہ میں تاخیر ہو رہی ہے، لیکن اس درمیان میں ایک جرمن سائنس داں نے پہلے میمونی انسان (Ape Man) کے پیدا کرنے کا امتیاز حاصل کر لیا ہے،

جانوروں پر اس قسم کے تجربے اس سے پہلے بھی ہو چکے ہیں، چنانچہ نر چیتا اور مادہ شیر کے جوڑ سے ایک خاص قسم کا جانور پیدا کیا گیا ہے، جسے "ٹائگن" (Tigon.) کہتے ہیں، اس پر چیتے کی دھاریاں ہوتی ہیں، مگر اسکی، لیکن شیر کی ایال نہیں ہوتی، اسی طرح گھوڑے اور خچر کا جوڑ ہے، کتے کا لومڑی سے، اور خرگوش کا گنی پگ (Guinea-pig ، ایک چھوٹا سا جانور جس کی دم اور کان چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن صورت میں خرگوش سے مشابہ ہوتا ہے،) سے بڑے عجیب و غریب جانور پیدا کئے گئے ہیں، بھینسے اور گائے کے جوڑ سے ایک بہت قوی جانور پیدا کیا گیا ہے، جس کو کٹیلو (Cattalo) کہتے ہیں، بھیڑ اور بکری کے جوڑ سے بھی بچہ پیدا کرانے کی کوشش کامیاب ثابت ہو چکی ہے،

لیکن حیوانی انسان کے موجودہ تجربوں کی طرح اکثر جانوروں پر بھی جو تجربے ابتک کر گئے ہیں، وہ توالد اور تناسل کے ایک مصنوعی طریقے سے کئے گئے ہیں، اس حیرت انگیز طریقہ کی ایجاد سے استقرارِ حمل کے لئے دو جانوروں کو ایک جگہ لانے کی ضرورت باقی نہیں رہی، ایک خاص قسم کی نلکی تیار کی گئی ہے، جسکے ذریعہ سے ایک جانور کا مادۂ تولید دوسرے جانور کے جسم میں پہونچا دیا جاتا ہے، تھوڑے دن ہوئے اس مصنوعی طریقہ سے پولینڈ کی ایک بھیڑ نے بچہ دیا تھا، مینڈھا انگلستان میں تھا، اور اسکے مادۂ تولید کا ایک قطرہ نلکی میں رکھ کر برف کے اندر بند کر کے ہوائی ڈاک سے پولینڈ لایا گیا تھا، جو جانور دوسری جنس کے جانوروں سے خود جفت نہ ہوں گے (اور اکثر ایسے ہی ہیں) انکو اسی مصنوعی طریقہ سے عجائب خانہ کے کسی جانور کے ساتھ جفت کیا جا سکتا ہے، لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تجربہ ہر صورت میں کامیاب بھی ہوگا، یہ صرف تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مخلوط الجنس بچہ پیدا ہوگا یا نہیں، کس شکل وصورت کا ہوگا، آیا انسان کے لئے کارآمد بھی ہوگا یا نہیں، خچر کی طرح اپنی جنس کے بچے پیدا کرنے سے قاصر ہوگا، یا کٹیلو کی طرح اپنی نسل بڑھا سکے گا،

"ع ز"

ادبیات

جذبِ اثر

از جناب نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

کون شے ہے جو ترے حسن سے معمور نہیں
سینۂ ذرہ بجز یک ورقِ نور نہیں،

گو ادب گاہِ محبت میں یہ دستور نہیں
عرضِ خمیازہ بھی اب تشنہ سے کچھ دور نہیں

رازِ نو چھین لے فطرت سے یہ مقدور نہیں
جوش زن دل میں ترے جذبہ منصور نہیں

ایک دلچسپ فسانہ ہو کہ سنتے رہئے
نفس اگر غلط نہیں، روح اگر حور نہیں

اسقدر دھیان رہے آنکھ چرانے والے
عشقِ ہنگامہ طلب ضبط پہ مجبور نہیں،

آبلے پھوٹ کے دیتے ہیں صدا لبیک
ہمت اے شوق کہ منزل بھی کچھ اب دور نہیں

ایسے ہنگامے وہاں روز ہوا کرتے ہیں
کشتۂ ناز فقط سرمد و منصور نہیں

خونِ حسرت میں بھی اک کیف ہے مدہوشی کا
عشرت انگیز فقط بادۂ انگور نہیں

عشق بھی حسن ہے جب سوز میں ہو سازِ نیک
منزلِ شمع سے پروانہ بہت دور نہیں

اپنے خرمن کے لئے آپ ہی بجلی بن جا،
دل اگر جلوہ گہ برقِ سرِ طور نہیں

نشہ آنکھوں میں اتر آیا باندازِ خمار
اور ابھی دور میں وہ نرگسِ مخمور نہیں

اب وہ عالم ہے ترے دردِ محبت کے نثار
التفاتِ نگہِ ناز بھی منظور نہیں،

گلشنِ عشق سے کیا پھول چنے گا وہ اثر
لذت اندوزیٔ غم کا جسے مقدور نہیں،

کلامِ امجد

از حکیم الشعرا جناب احمد حسین صاحب امجد

چارہ گر کو نظر نہیں آتا، داغِ دل کیوں اُبھر نہیں آتا

جو نظر آتا ہوں نہیں ہوں میں اور جو کچھ ہوں، وہ نظر نہیں آتا

اس کی آنکھوں میں کچھ جگہ پاؤں مجھے ایسا ہنر نہیں آتا

میرے ہمرہ ہے راہبر میرا پھر بھی میں راہ پر نہیں آتا،

نہ کرو کوئی آرزو امجد

اس شجر میں ثمر نہیں آتا

غزل

جناب سید عبد العلی صاحب تجرالہ آبادی

نیرنگِ التفات ہے پردہ کہیں جسے اک عکسِ حسنِ یار ہے، دنیا کہیں جسے

تیری نگاہِ مست میں سرمایۂ نشاط وہ کیف ہے کہ مستیِ صہبا کہیں جسے

وہ آگ اپنے عشق کی سینے میں پھونک دے ہم بے قرار آتشِ سینا کہیں جسے

پھر اس طرف ہو وہ نظرِ التفاتِ خاص ہم اپنی زندگی کا سہارا کہیں جسے

اک پرتوِ لطیف ہے وہم و خیال کا، ہم اصطلاحِ عشق میں جلوا کہیں جسے

وہ موجِ بے خودی ہمیں ہر لحظہ چاہیئے حسنِ فریبِ مستیِ صہبا کہیں جسے

پھر جوشِ آرزو کے تلاطم سے دل میں ہو،

اک موجِ اضطراب کہ دریا کہیں جسے،

بابُ التقریظ والانتقاد

خاتمہ

"مصنفہ حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، مصححہ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم اے، سی ای، وظیفہ یاب ناظم تعمیرات سرکار عالی انگم پلی حیدرآباد دکن، ضخامت ۲۳۰ صفحے قیمت عکر

حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ کے جانشین حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید جناب حضرت خواجہ سید محمد یوسف حسینی گیسو دراز جن کے بدولت دکن میں اسلام کا نور چمکا، اور جو گلبرگہ دکن میں آسودۂ خواب ہیں، دنیا کو اون کی کسی تصنیف کی زیارت نہ تھی، بلکہ بہت سے اسکو جانتے بھی نہ تھے کہ انھون نے اپنی یادگار کچھ اوراق بھی چھوڑے ہیں، حافظ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم اے، سی ای، وظیفہ یاب ناظم تعمیرات سرکار عالی کا سب کو مشکور ہونا چاہیئے کہ انھون نے بڑی تلاش اور محنت سے حضرت کی کتابون کا کھوج لگایا، اور صحت کر کے اونکو چھپوانے کا کام کیا، پہلے عام طور سے یہی معلوم تھا کہ وہ ایک بزرگ صوفی تھے، مگر اون کی کتابوں کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنّت کے بڑے عالم بھی تھے، اور بزرگانِ چشت میں ان کی حیثیت "سلطان القلم" طائفہ کی تھی، مشہور ہے کہ ایک سو پانچ برس کی عمر تھی، اور ایک سو پانچ ہی انکی تصنیفیں تھیں، جن میں سے مشہور کے نام یہ ہیں، الملتقط (تفسیر) بطرز کشاف زمخشری، شرح مشارق الانوار (حدیث) شرح فقہ اکبر (کلام) عربی و فارسی، اور تصوف میں معارف شرح عوارف شیخ سہروردی عربی میں ترجمۂ عوارف فارسی میں، شرح فصوص الحکم

ابن عربی، شرح تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی (شاگرد امام احمد غزالی) شرح رسالہ قشیریہ امام قشیری، اسمار الاسرار اور خاتمہ،

مولوی سید عطا حسین صاحب نے پہلے اسمار الاسرار صحت کرکے چھپوائی تھی، جس کا ذکر معارف کے صفحوں میں آچکا ہے، اور اب انھوں نے خاتمہ کو سلیقہ اور محنت سے چھپوایا ہی،

حضرت ابو النجیب سہروردیؒ کی ایک مشہور کتاب آداب المریدین ہے، جس میں تصوف کے طالب کے لئے قرآن و حدیث سے ہدایات اور تعلیمات ہیں، اسکی شرح حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری بہاری نے لکھی ہی، دوسری شرح حضرت مخدوم سید محمد گیسو دراز نے لکھی، اور شاید چند بار لکھی، آخری شرح جو ۸۱۳ھ میں لکھی، اوس کا ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے،

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے آداب المریدین کی جو شرحیں وقتاً فوقتاً لکھین، ان میں سے کسی ایک کے تکملہ یا ضمیمہ کے طور پر ۸۰۰ھ میں یہ کتاب خاتمہ لکھی، جس کا نام زیب عنوان ہی، کتاب کا موضوع آداب مریدین ہی یعنی ایک طالب صوفی کو سلوک کے راستہ کے ہر موقع و مقام سے باخبر کیا ہے، اور اسکی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ہدایتیں دی ہیں، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، نکاح، تجرد، کمانا، وضو، نماز وغیرہ غرض ایک طالب کی پوری زندگی کا سارا پروگرام مرتب کر دیا گیا ہی،

مولوی سید عطا حسین صاحب نے کتاب کی تصحیح اور عمدگی میں پوری کوشش کی ہے، کتاب کو تین قلمی نسخوں پر مبنی کیا ہی، شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہی جس میں مصنف کے حالات اور خاص طور سے اس تصنیف پر گفتگو کی ہے، آخر میں چند تعلیقات بڑھائے ہیں، جن میں مصنف کے بعض حوالہ طلب فقروں کی تفصیل مصنف کی دوسری تصنیفات یا تصوف کی دوسری کتابوں سے کی ہی،

سماع کی بحث حضرت نے بڑی تفصیل سے لکھی ہی، اس میں مزامیر کی نسبت یہ فقرہ آج بھی چشتی صوفیوں کے سننے کے لائق ہی:-

وانچہ از روے شرع میان فقہا اجماع بتحریم آنست، چنانچہ بعض مزامیر ازان نیز بحد محترز باشد خصوصاً کسے راکہ از اہل ارشاد و دعوت بود، (صـ۳۳)

اہل ادب کو اس کتاب میں بعض ادبی نکتے بھی ملین گے، ایک دو ہندوستانی لفظ بھی ملتے ہیں، جیسے "دھکہ"،

"چنان نرود کہ "دھکہ" بکسے رسد" (صـ۳۲)

سماع کے اشعار کی زبان کیا ہو، اس سلسلہ میں ہندوی کا تذکرہ اس طرح آتا ہی:-

"میل در پارسی و عربی باید بیشتر از ہندوی بود، وآنکہ در ہندوی سخنے فاحشے بود، اگرچہ عل درستے دست می دہد، اعراض ازاں بہتر، برائے آن چیز ہا خلوت لائق تر است، وتنہائی مبارک تر" (صـ۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں صوفیوں کی مجلس میں ہندی زبان داخل ہو چکی تھی لیکن چونکہ ہندی شعروں کے مضمون بہت کھلم کھلا اور صاف ہوتے تھے، اسلئے عام مجلسوں میں اُن کے سننے سے بچنے کی تاکید کی گئی، اور اسکے لئے خلوت بابرکت سمجھی گئی،

"س"

قانون بین الممالک

کے

اصول اور نظرین

مصنفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن، قیمت:- ۸ر ضخامت ۱۰۶ صفحے، تقطیع چھوٹی،

اس کتاب کا گو جولائی کے مطبوعات جدیدہ میں مختصر تعارف ہو چکا ہی، مگر کتاب مذکور کی

اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے ناظرین کو تفصیل کیساتھ روشناس کیا جائے، مصنف نے چونکہ جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے لکچرار ہیں، اس تقریب سے اپنے طالب علموں کی تعلیم کی خاطر انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی، پھر عام اہل شوق کے خیال سے اسکو چھپوا بھی دیا،

آج کل کی سیاسی فضا میں جب ساری دنیا گھر آنگن ہو رہی ہے، اور سلطنتوں کے باہمی تعلقات اتنے ہی گہرے اور بڑے ہوگئے ہیں، جتنے ایک خاندان کے افراد کے، اب اگر کوئی ملک یا سلطنت علحدہ رہنا بھی چاہے تو رہنے نہیں پاسکتی، اسلئے بین الممالک قانون اور سلطنتوں کے باہمی برتاؤ کے دستور العمل سے واقفیت کی بہت بڑی ضرورت ہے، یہ کتاب اس موضوع پر ہماری زبان کی سب سے پہلی کتاب ہے،

کتاب ایک مقدمہ اور مقصد کے تین بابوں پر حاوی ہے، مقدمہ میں سلطنت وحکومت کی پیدایش، پھر اس کے تعلق سے قانون کا وجود، اور پھر سلطنتوں کے باہمی تعلق میل جول اور برتاؤ، اور اس کے قانون اور دستور العمل کی مختصر تاریخ ہی، اس سلسلہ میں مصر وفلسطین، ہندوستان، یونان، روما، مسیحیت کے اثرات، اسلام کے اثرات، پھر جدید یورپ کا ذکر آتا ہی، اس کے بعد قانون کی تعریف، پھر مملکت، خودمختاری، نیابت، بغاوت، مستامن، مجلس اقوام، انتداب، بین الممالک شخصیت وغیرہ مباحث ہیں،

جزو "مقتدر مملکتوں کے ضمن میں مملکت حیدرآباد کی بین الممالکی حیثیت پر ایک دلچسپ بحث ہے، اس سلسلہ میں چند باتیں نہایت عجیب معلوم ہوئیں، جن سے سلطنت دکن کی شہنشاہانہ حیثیت نمایاں ہوتی ہے، شہر و ممالک سلطان دکن کی سلطنت میں ایک موروثی جمعدار نظم جمعیت یعنی بے قاعدہ عرب فوج کے افسر اور جاگیردار ہیں، مہاراجہ اندور حیدرآباد کے مواضع پارنہ اور بابل گاؤں کے موروثی پٹیل (پٹواری) ہیں، اسی طرح جے پور، جودھ پور، اور بیکانیر وغیرہ کے راجوں کی حیدرآباد کے صوبہ

اورنگ آباد میں جاگیریں اور انعامات ہیں، جو ان کو مغلیہ سلطنت سے ملے تھے، ان راجاؤں کے نائب عیدین کے موقع پر صوبہ دار اورنگ آباد کو نذریں پیش کرتے ہیں،

ایک سلطنت کو دوسرے سلطنت سے قدرتی طور پر تین ہی قسم کے تعلقات ہو سکتے ہیں، مسالمانہ مخاصمانہ اور بے طرفدارانہ، اصل کتاب انہی تین قدرتی تعلقات کی تفصیل پر منقسم ہے، مسائل کے بیان میں تاریخی واقعات، قوانین بین الممالک اور یوروپین مقننوں کے بیانات اور فیصلے بحث اور دلیل کے طور پر جگہ جگہ لائے گئے ہیں،

کتاب کے فنی حسن و قبح پر تو صرف متقنن ہی اصحاب کچھ کہہ سکتے ہیں، لیکن ایک سرسری مطالعہ سے جو باتیں اس چھوٹی سی کتاب کی خصوصیات نظر آتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے اور ابھی شعبۂ علوم اسلامیہ کی صدارتی تقریر میں بھی شکایت کی گئی ہے، کہ کسی علم وفن کی تاریخ بیان کرتے وقت یورپ کے مصنف اور اہل قلم مسلمانوں کے دور کو بالکل نظرانداز کر جاتے ہیں، اور یونان و روم کے بیان کے بعد فوراً ایک ہزار برس کی چھلانگ مارکر نئے یورپ میں پہونچ جاتے ہیں، اب یہ خود مسلمانوں کا کام ہے، کہ وہ علوم وفنون کی تاریخ میں اسلامی دور کا ذکر کرکے ان کی بیچ سے ٹوٹی ہوئی کڑی کو جوڑ دیں، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی نگاہ سے جیسی کہ توقع تھی، یہ نکتہ اوجھل نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلی دفعہ اسلامی بین الممالک قوانین کو اسکی مناسب جگہ دی گئی ہے، اور یہ ایک لطیف بات پیدا کی ہے، کہ فقہ اسلامی میں کتاب السیر کا باب یا اس فن پر جو مستقل کتابیں سیر کے نام سے لکھی گئی ہیں، جیسے کتاب السیر امام محمد وغیرہ، وہ درحقیقت اسلامی قانون بین الممالک کے اجزا اور عناصر ہیں،

۲۔ مصنف نے خود یوروپی مستند مولفوں کے بہ کثرت حوالوں سے یہ ثابت کیا ہی، کہ موجودہ یوروپی قانون بین الممالک، اسلامی مماثل قانون اور رواج سے بے حد متاثر ہے،

۳۔ درسی کتابوں میں جہاں صرف یورپ اور امریکہ کے واقعات نظیر میں پیش ہوتے ہیں، وہاں تاریخ اسلام اور تاریخ ہند سے ہر جگہ استناد کیا ہے، تاکہ طالب علم صرف نظریات پڑھ کر بھول نہ جائیں بلکہ اس پر خود اپنی چیزوں کو جانچ کر ان کی قدر رکھیں،

۴۔ ہر دور کی خصوصیتیں بتائی ہیں، کہ یونانی دور میں قانون بین الممالک میں کیا بات، رومی دور میں کیا، قرون متوسط میں کیا، اور اسلامی عہد میں کیا نمایاں تھی، اور جدید مغربی دور میں کیا ہے، اور اس طرح آسانی سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مغربی تمدن کو ابھی اسلامی اصول تک پہنچنے کے لئے زمانہ درکار ہے،

۵۔ اس علم کے اصطلاحات کے لئے مصنف نے اسلامی فقہ کے باب السیر اور باب الجہاد کی اچھی طرح چھان ڈالی ہیں، اور ان ہی کو چن کر استعمال کیا ہے، جیسے متامن، مقاتل، حربی وغیرہ جن سے بہتر لفظ نہیں مل سکتے تھے، اسی کے ساتھ ہندوستانی زبان کا لحاظ کرکے خود ہندوستانی الفاظ کو اصطلاحات کا درجہ دیا ہے، گو ان ہندوستانی لفظوں کا اصطلاحات بننا ابھی ناگوار معلوم ہوتا ہے، مگر یہ سب کو معلوم ہے کہ بازار میں جو چل جائے وہی کھرا سکہ ہوتا ہے، "س"

مسلمان اور سائنس

مصنفہ خان بہادر ابو عبد اللہ محمد ذکا اللہ خان صاحب ایم اے ریٹائرڈ کلکٹر دامت تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۶ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۴ ر پتہ و تیا اسٹیٹ،

خان بہادر ابو عبد اللہ محمد ذکا اللہ خان صاحب پرانے باوضع اور مخلص مسلمانوں میں ہیں، مسلمانوں کی پستی اور زبون حالی سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ رسالہ لکھا ہے، اس میں انھوں نے مسلمانوں کے تنزل کا سبب سائنس کی تعلیم سے ان کی غفلت کو قرار دیا ہے، اور اسکی ذمہ داری

علماء پر عائد کی ہے اور مذہبی اور تاریخی دلائل سے دکھایا ہے، کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بقا کے لئے سائنس کی تعلیم ایک مذہبی فرض ہے، اگرچہ اس رسالہ کا اصل موضوع مسلمانوں کی سائنس کی تعلیم ہے، لیکن ضمناً اس میں مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی کمی اور عام تعلیم کے فقدان کے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، خان بہادر صاحب کے اخلاص اور حسن نیت میں کوئی شبہہ نہیں، ہم کو اس حد تک ان کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے، کہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے، اور ان میں صالح تعلیم نسواں کی پوری اشاعت ہونی چاہئے، لیکن اس کے اور مقدمات اور نتائج سے صرف اختلاف ہے، بلکہ وہ بالکل غلط ہیں، اولاً یہی صحیح نہیں ہے، کہ محض سائنس کی تعلیم سے غفلت مسلمانوں کے تنزل کا تنہا سبب ہے، ہاں منجملہ اور اسباب کے اسکو بھی ایک سبب قرار دیا جاسکتا ہے، پھر اس کا الزام علماء کے سر رکھنا قطعاً صحیح نہیں ہے، ممکن ہو کہ کسی زمانہ میں علماء کے کسی خاص طبقہ نے سائنس کی تعلیم کی مخالفت کی ہو، لیکن اس زمانہ میں غالباً اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کیجا سکتی، اس کا الزام درحقیقت مسلمان طلبہ کی پست ہمتی اور راحت طلبی کے سر ہے، جن کا مطمح نظر حکومت کے عہدوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، بلکہ ان سے بھی زیادہ اس ناقص نظام تعلیم کے سر ہے، جس کا منشا ہی کسی شعبہ کے ماہر اور محقق پیدا کرنا نہیں ہے، یوں کوئی ذاتی صلاحیت سے اتفاقاً پیدا ہوجائے تو اس کی ذمہ داری سے نظام تعلیم بری ہے، بالفرض اگر کسی زمانہ میں کسی خاص جماعت نے مخالفت کی بھی تھی، تو سائنس کی نہیں، بلکہ نفس غیر زبان کی تعلیم کی تھوڑی سی ترمیم کیساتھ جیسی آج بڑے بڑے ماہرین تعلیم مخالفت کر رہے ہیں، گو دونوں کے اسباب اور نقطہائے نظر جداگانہ ہیں، لیکن اس مخالفت کے باوجود آج ہزاروں مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اگر سائنس کی تعلیم سے غفلت علماء کی مخالفت کا نتیجہ ہوتی، تو آج ایک مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے والا نہ ملنا چاہئے تھا، صالح تعلیم نسواں کا ایک عالم بھی مخالف نہیں ہے، البتہ انھوں نے خود اس کی جانب کوئی عملی قدم نہیں

اٹھایا، اس کے مختلف اسباب ہیں، ایک بڑا سبب یہ ہی کہ جدید تعلیم کی باگ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے ہاتھ میں ہی، جو شاید اس میں علمار سے مشورہ لینا بھی پسند نہ کریں گے، دوسرے ابتک مسلمانون میں مردوں کی مذہبی تعلیم کا پورا انتظام نہیں ہوسکا، ایسی حالت میں علما، عورتوں کی مخصوص تعلیم کی طرف کس طرح توجہ کرسکتے تھے، عام تعلیم کے نقدان کی ذمہ داری گورنمنٹ کے سر ہے، ملک کی عام تعلیم بغیر گورنمنٹ کی امداد کے ناممکن ہے، رہ گیا یہ سوال کہ علمانے عربی مدارس میں سائنس کی تعلیم کیون داخل نہیں کی یا انھوں نے تعلیم نسواں کی اشاعت میں کیوں حصہ نہیں لیا، اس کا جواب بالکل کھلا ہوا ہے، عام مسلمانوں کی غربت اور ارباب ثروت کے احساس فرض کا یہ حال ہے کہ عربی مدارس اپنی سادگی اور کفایت شعاری کے باوجود معلوم نہیں کس مصیبت سے چلتے ہیں، ایسی حالت میں سائنس کی گران تعلیم اور تعلیم نسواں کو کون عالم خیال میں لاسکتا تھا، بہرحال ان اختلافی مقدمات کو چھوڑکر ہمکو خان بہادر صاحب کے مساعی سے پورا اتفاق ہے، خدا انکو اس عمل خیر میں کامیاب اور انکی سعی مشکور فرمائے،

"م"

علم کلام

مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ، اسکے عہد بعہد کی ترقیان، اور علمائے متکلمین کے نظریات اور مسائل

طبع چہارم مطبوعہ معارف پریس ضخامت ۲۰۴ صفحے، قیمت :- عار

الکلام

مولینا شبلی مرحوم کی مشہور تصنیف، جدید علم کلام، جس میں عقلی دلائل سے مذہب کو فلسفہ کے مقابلہ میں ثابت کیا ہی، اور ملاحدہ اور منکرین کے دلائل کو رد کیا ہے، اور عقائد اور اصول اسلامی کی فلسفیانہ تشریح

طبع سوم مطبوعہ معارف پریس ضخامت :- ۲۰۵ صفحے، قیمت :- عار

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

قادیانی مذہب مولفہ جناب مولوی سلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی ناظم مجلس تالیف وترجمہ جامعہ عثمانیہ، تقطیع بڑی ضخامت ۰، ۱ اصفحات کاغذ سپید کتابت وطباعت اچھی، قیمت ہے، پتہ کمال احمد صاحب بیت السلام حیدرآباد دکن،

پروفیسر الیاس برنی صاحب کی مشہور کتاب "قادیانی مذہب" کے لئے اب کسی تعارف کی حاجت نہیں، قادیانی مذہب کا نام آتے ہی فوراً اس کے ہم نام تریاق کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہی، اسکی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ چند سال کے عرصہ میں اسکے پانچ اڈیشن نکلے، جو ہندوستانی کے کسی کتاب کو کم نصیب ہوئے ہوں گے، اس کے مختلف اڈیشنون پر برابر معارف میں ریویو ہوتا رہا، زیر نظر پانچواں اڈیشن مزید اضافوں کے ساتھ حال میں شائع ہوا ہے، جو ابواب و مباحث کی کثرت میں پہلے چاروں اڈیشنون سے بہت بڑھا ہوا ہی، اس کتاب کو قادیانی مذہب کا "دائرۃ المعارف" کہنا چاہئے، اس میں سارے قادیانی لٹریچر کا جوہر کھینچ لیا گیا ہے، اس کا کوئی پہلو اس کے احاطہ سے باہر نہیں، اس کے مطالعہ سے قادیانیت کے "اندرونی اسرار" اور "بیرونی مناظر" سب نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، یہ کتاب مناظرہ کی کتابون میں اس حیثیت سے خاص امتیاز رکھتی ہے، کہ اس میں مصنف نے بعض مفید حواشی کے علاوہ خود اپنے قلم سے کچھ نہیں لکھا ہی، بلکہ خود مرزا غلام احمد اور قادیانی مذہب کے اکابر کے قلم وزبان سے ان کے مذہب کی تصویر دکھا دی ہے، انھون نے محض قادیانیوں کی تحریروں

اور تقریروں کو ایک خاص ترتیب و تبویب کے ساتھ جمع کر دیا ہے، جس سے قادیانیت کی حقیقت بالکل آئینہ ہو جاتی ہے، گویا مصنف کے قلم نے خط و خال میں خود کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، بلکہ صرف چہرہ سے نقاب ہٹا دی ہے، پھر اتنی ضخیم کتاب میں کسی مقام پر تہذیب و متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، جو مناظرانہ تحریروں میں بہت دشوار ہے، یہ کتاب عام مسلمانوں سے زیادہ ان تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے، جو قادیانیوں کی "تبلیغ" سے زیادہ متاثر ہیں، کہ اس سے انکی حقیقت بھی کھل جاتی ہے، اللہ تعالیٰ برنی صاحب کی اس خدمتِ دین کو قبول فرمائے،

النبی الخاتم - مولفہ مولانا مناظر حسن صاحب گیلانی، صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر علاوہ محصول ڈاک پتہ مکتبہ علیہ چار مینار و مکتبہ ابراہیمیہ مصطفےٰ بازار حیدر آباد دکن،

سیرۃ پاک کا سدا بہار چمن ایسا وسیع ہے کہ اس کے رنگا رنگ پھولوں کے بے شمار گلدستے بناتے چلے جائیے، پھر بھی گلچینِ بہار کو "دامانِ نگہ" کی تنگی کی شکایت رہیگی، اس پاک موضوع پر معلوم نہیں کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور خدا معلوم کب تک یہ سلسلہ قائم رہے گا، کہ ع

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان

النبی الخاتم بھی اسی چمن زار کا ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جسے مولانا مناظر حسن صاحب کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرۃ پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کئے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب اپنے طرز میں منفرد ہے، کہ تاریخی واقعات کو دارفتگی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے، کہ ناقدین خوش فہم اور اربابِ وجد و حال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں، زبان صاف و سادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے،

ترجمان وہابیہ مولفہ نواب صدیق حسن خان مرحوم تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۴ صفحات کاغذ طباعت نہایت معمولی قیمت ۱۲ر علاوہ محصول ڈاک ۲ر پتہ منیجر حقانی بک ڈپو امرتسر،

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد بعض غلط فہمیوں کی بنا پر "وہابی" اور "وہابیت" کے الفاظ گورنمنٹ کی نظروں میں بغاوت کے ہم معنی بن گئے تھے، اس غلط فہمی کو سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے دور کرنے کی کوشش کی، نواب صدیق حسن خان مرحوم کے عروج کے زمانہ میں ان کے حاسدوں نے انھیں گورنمنٹ کی نظروں میں معتوب بنانے کے لئے ان پر وہابیت اور ان کی بعض نا تمام تحریروں سے مسلمانوں کو جہاد پر برانگیختہ کرنے کا الزام لگایا، اس کی تردید میں انھوں نے یہ رسالہ لکھ کر شائع کیا تھا، انکی وفات کے بعد بھی ایک مرتبہ یہ رسالہ شائع ہوا تھا، اب حقانی بکڈپو نے پھر شائع کیا ہے، اس میں وہابیت کی تاریخ، ہندوستان کی جماعت "اہلحدیث" اور عرفی وہابی کا فرق، جہاد کی حقیقت اور اسکے شرائط جیسے برطانیہ سے ریاست بھوپال کی وفاداری اور بہت سے تاریخی اور مذہبی واقعات و مباحث ہیں، جن سے دونوں الزاموں سے برأت ہوتی ہے، اس قسم کی کتابیں وقتی ہوتی ہیں، اب انکی اشاعت سے سوائے پرانی یادگار کے اور کوئی فائدہ نہیں،

مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا نصب العین از نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ محمد مقتدیٰ خان شروانی انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڈھ،

یہ مقالہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے جامعہ ملیہ دہلی کے اساتذہ اور طلبہ کے جلسہ میں پڑھا تھا، یہ اسلامی آدابِ تعلیم و تعلم پر مفید رسالہ ہے، ابتدا میں علم و تعلیم کی اہمیت اور اس کے فضائل پر کلام اللہ اور احادیثِ نبوی سے روشنی ڈالی گئی ہے، پھر امام بدر الدین بن ابی اسحاق کنانی کی کتاب تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم اور امام

برہان الاسلام زرنوجی کی کتاب "تعلیم المتعلم طریق التعلم" کے ضروری مباحث و مطالب کا جو اسلامی آداب تعلیم و تعلم پر بہترین کتابیں ہیں، خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم و تعلم کے کیسے اخلاقی اور پاکیزہ اصول و آداب قائم کئے تھے، آخر میں مسلمان علما کے علمی کارناموں سے کچھ واقعات ہیں، یہ رسالہ گو مختصر ہے، اور ایک قدیم طریقۂ تعلیم و تعلم پر ہے، لیکن سلف کے آداب تعلیم کا عطر کھینچ لیا گیا ہے، اور آج بھی معلم و متعلم اس کے پاکیزہ اصولوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں،

لیونارڈ و گرٹروڈ، مترجمہ جناب غلام حسن صاحب بی ایس سی ڈپ ایڈ ٹیچر ٹریننگ اسکول گلبرگہ حیدرآباد دکن تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۴۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، مصنف سے ملیگی،

یہ کتاب مشہور فلسفی اور مصلح تعلیم جان ہنرش پستالوزی کی کتاب "لیونارڈ و گرٹروڈ" کا ہندوستانی ترجمہ ہے، اس میں کسانوں اور دیہاتوں کی اصلاح اور عورتوں کے ذریعہ سے بچوں کی تربیت و تعلیم کو افسانہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اس فسانہ میں سوئزرلینڈ کے ایک گاؤں یونال کی سماجی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، جس کے باشندے، جہالت، غربت، شراب نوشی، جوا، ظلم و فریب طرح طرح کی بداخلاقیوں میں مبتلا ہیں، ایک ادنیٰ طبقہ کی عورت لیونارڈ و اصلاح کا بیڑا اٹھاتی ہے، اور پہلے اپنے شرابی شوہر کی اصلاح اور اپنے بچوں کی بہترین تربیت کرکے اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیتی ہے، اسکی اصلاح سے متاثر ہو کر ایک فوجی افسر اسکی تربیت و تعلیم کے نمونہ کا ایک مدرسہ قائم کرتا ہے، ایک رئیس بھی ساتھ ہو جاتا ہے، بداخلاق مفسدین ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، لیکن انکی مخلصانہ کوششوں سے وہ گاؤں جو تمام برائیوں کا مخزن تھا، چند دنوں میں ہر طرح کی بھلائیوں کا سرچشمہ بنجاتا ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ آج کل کے اصلاحِ دیہات کے پروگرام میں اس سے مدد لیجائے، ترجمہ خاصہ ہے، لیکن غالبًا اصل کتاب کی ژولیدگی بیان کا اثر پورا زائل نہ ہو سکا،

کتاب العین، مصنفہ جناب ڈاکٹر عطاء اللہ صاحب بٹ پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی تقطیع بڑی ضخامت علاوہ انڈکس و فہرست مصطلحات ۸۱۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر جلد خوبصورت، قیمت عے، پتہ:۔ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ،

یہ مفید کتاب آنکھوں کے امراض اور ان کے علاج پر ہے، غالبًا ہندوستانی زبان میں اس موضوع پر کوئی مبسوط و مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ہے، جناب ڈاکٹر عطاء اللہ صاحب نے یہ کتاب لکھکر ہماری زبان میں ایک ضروری اور مفید اضافہ کیا ہے، فنی نقطۂ نظر سے اس کی خوبیاں تو اس فن کے ماہر ہی بتا سکتے ہیں لیکن مباحث کے تنوع انکی کثرت، کتاب کی ضخامت اور تصاویر سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس موضوع پر یہ جامع اور مستند کتاب ہوگی، اس میں تشریح و منافع اعضاء، مبادی مناظریات، معائنہ چشم امراض چشم اعمال جرحیہ اور علاج وغیرہ امراض و علاج چشم کے متعلق جملہ ضروری مباحث شرح و بسط کیساتھ بیان کئے گئے ہیں، اور تصویروں کے ذریعہ سے اوسکو واضح کیا گیا ہے، اور انکی عملی شکلیں دکھائی گئی ہیں اس کتاب کا مطالعہ ڈاکٹروں کے علاوہ یونانی اطباء کے لئے مفید ہوگا،

اشعارِ ذوق، مؤلفہ جناب عبد المنان صاحب بیدل ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج پٹنہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸؍ پتہ لالہ رام نرائن لال بک سیلر الہ آباد

یہ درسی کتاب پروفیسر عبد المنان صاحب بیدل نے پٹنہ یونیورسٹی کے الف اے کلاس کے لئے لکھی ہے، اس میں شیخ ابراہیم ذوق کے مختصر حالات، ان کے بعض مشہور تلامذہ کا ذکر، کلام ذوق پر ناقدین کی موافق و مخالف رائیں ہیں، اور کلامِ ذوق پر تبصرہ کرکے اس کے محاسن دکھائے گئے ہیں، آخر میں کلامِ ذوق کا انتخاب ہے، اس سلسلہ میں خوش قسمت غالب کے کلام کے ساتھ موازنہ بھی آگیا ہے، اور حسب دستور پروفیسر صاحب نے اپنے ممدوح کے کلام کو ترجیح دی ہے، نفس تبصرہ کی حیثیت سے کلامِ ذوق پر اچھا نقد ہے،

حشرات الارض مصنفہ جناب فضل الرحمن صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۳ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز ڈرامہ ہے، جس میں بازاری بندۂ زر اخبار نویسوں خود غرض جاہ پسند خائنوں، اور سچے مخلص کارکنوں کی سیرت کا کامیاب مرقع پیش کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ بعضوں کے سر پر یہ ٹوپی ٹھیک اتر جائے،

خیالاتِ آزاد حصہ دوم مصنفہ جناب سید محمد حسین صاحب آزاد حیدرآبادی تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول ڈاک، پتہ درویش منزل مستعد پورہ و آزاد منزل فلک نما حیدرآباد دکن،

حاجی سید محمد حسین صاحب آزاد حیدرآباد کے ممتاز مگر شہرت سے نفور شعراء میں ہیں، اسی لئے دکن سے باہر ان کی شہرت نہ پھیل سکی، خیالاتِ آزاد ان کے مجموعۂ کلام کا دوسرا حصہ ہے، اس مجموعہ میں تمام اصناف کے نمونے موجود ہیں، تھوڑا سا فارسی کلام بھی ہے، اور سب میں قادر الکلامی اور پختگی نمایاں ہے، ہر صنف میں انھوں نے نہایت کامیاب طبع آزمائی کی ہے، ان کا خاص رنگ اکبر مرحوم سے ملتا جلتا ہوا مزاحیہ ہے، اور اس رنگ میں وہ اسقدر کامیاب ہیں کہ ان کے بعض بعض اشعار پر اکبر مرحوم کے کلام کا دھوکا ہو جاتا ہے،

اشرف الذکر حصہ اول، مولفہ جناب مولوی مظہر احمد صاحب ادہمی، بی اے منشی فاضل ہڈ مولوی انگلو ٹذل اسکول بھوپال تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۳ر مصنف سے ملیگی،

یہ رسالہ تیسرے درجہ کے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے، اسمیں اسلام کے ضروری عقائد، وضو، اذان، نماز، نماز جنازہ اور غسل میت کے ضروری مسائل بتائے گئے ہیں، عربی دعاؤں اور قرآنی سورتوں کا تحت اللفظ اور مسلسل ترجمہ دیدیا گیا ہے، آخر میں کچھ مفید اخلاقی باتیں بتائی گئی ہیں،

"م"